کچھ اور مختصر کہانیاں

☆ چلڈرن بک ٹرسٹ ☆ قومی کونسل برائے فروغ زبان اردو ☆ بچّوں کا ادبی ٹرسٹ

پہلا انگریزی ایڈیشن : 1987
پہلا اُردو ایڈیشن : مارچ 2001
تعداد اشاعت : 3000

قیمت : 30.00 روپے

This Urdu edition is published by the National Council for Promotion of Urdu Language, M/o Human Resource Development, Department of Education, Govt. of India West Block-I, R.K. Puram, New Delhi, by special arrangement with Children's Book Trust and Bachchon Ka Adabi Trust, New Delhi and printed at Indraprastha Press (CBT), New Delhi.

فہرست

کاغذ کی ناؤ

بارش کے گدلے پانی کے نالے پر جھکی انا نے کاغذ کی ایک اور ناؤ بہت دھیمے سے اُس میں چھوڑ دی۔ پہلی دو ناووَں کی طرح یہ بھی تیزی سے بہتی چلی گئی۔

ہر دفعہ ناؤ جب بھی اس طرح بہتی اَنا خوشی سے چلانے لگتی۔ لیکن اس مرتبہ ایک ناخوش گوار بات ہوئی۔ ایک لڑکا اُس کی ناؤ پر جھپٹا اور اُسے اُٹھالیا۔ اُس نے ناؤ کے اوپر سے پانی صاف کیا اور اُس کو اُلٹ دیا۔

اَنا نے اُس لڑکے کو گھورا۔ وہ بھاری بھرکم اور گندا تھا۔ وہ ناؤ کو دیکھنے میں اتنا منہمک تھا کہ اُس نے اَنا کی غصہ بھری آنکھیں نہیں دیکھیں۔ وہ پیچھے مڑی اور گھر کے اندر بھاگ گئی۔

گھر میں ادتی آنٹی آرام کرسی پر بیٹھیں بارش سے دُھلے ہوئے درختوں اور خوب صورت آسمان کا نظارہ کر رہی تھیں۔ اَنا کا چہرہ سُرخ ہو رہا تھا اور منہ پھولا ہوا تھا۔

''اُس گندے لڑکے نے میری ناؤ چھین لی ہے'' انا بولی۔

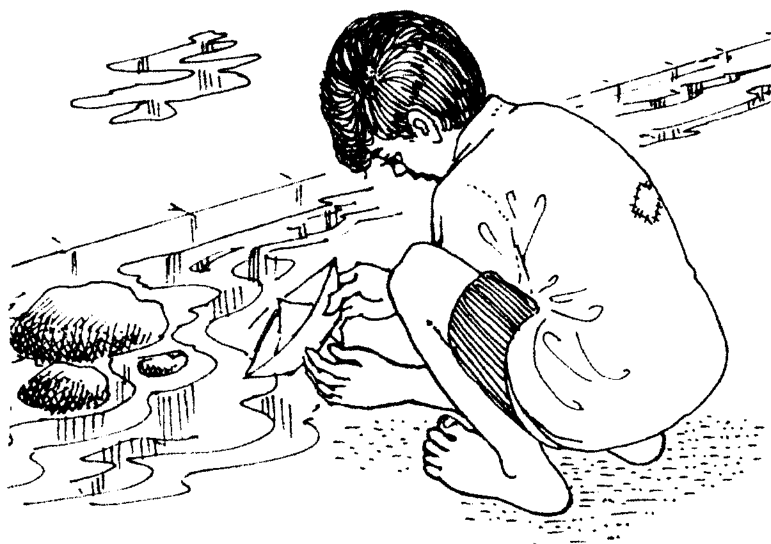
''کوئی بات نہیں ہے تمھارے لیے ایک دوسری ناؤ بنادوں گی''۔

ادتی آنٹی نے اُسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

''اگر اُس نے وہ بھی لے لی تو؟''

''تب میں کچھ اور ناؤ بنادوں گی''۔

''فرض کیجیے وہ سب لے لیتا ہے؟''



"نہیں وہ ایسا نہیں کرے گا! کیوں کہ میں اُس کے لیے بھی دو ناؤ بنادوں گی"۔

"لیکن آپ اُس کے لیے کیوں بنائیں گی؟"

"کیوں کہ میں سمجھتی ہوں اُس کی کوئی اونی آنٹی نہیں ہیں، جو اُسے ناؤ بنا کر دے"۔

"تب...... وہ خود سے کیوں نہیں بنالیتا؟ وہ تو کافی بڑا ہے"۔

"ٹھیک ہے اَنا، لیکن ہو سکتا ہے کسی نے اُسے ناؤ بنانا سکھایا ہی نہ ہو"۔

"وہ اسکول کیوں نہیں گیا؟ وہ بہت بُرا ہے۔ وہ نہیں جاسکا"۔

اونی آنٹی صرف مسکرا کر رہ گئیں۔ اسی بیچ انھوں نے کاغذ کے کچھ چوکور ٹکڑے کاٹ لیے تھے اور وہ ایک کو موڑ بھی چکی تھیں۔ کچھ ہی دیر میں ایک ناؤ تیار ہو گئی۔ پھر انھوں نے چند ناؤ اور بنادیں۔ آخر میں انھوں نے سب ناؤ اَنا کو دے دیں اور بولیں

"لو یہ لے لو، دوڑ جاؤ اور موج کرو"۔

انا اپنی جگہ سے نہیں ہلی، وہ ابھی تک افسردہ تھی۔ وہ اُس لڑکے سے کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہتی تھی لیکن اُس کے علاوہ کوئی چارہ بھی نہ تھا۔ اب بارش تھم چکی تھی اور بارش کا گدلا شور کرتا اور بل کھاتا ہوا پانی دعوت دے رہا تھا۔

ناؤوں کو مضبوطی سے پکڑے اَنا ہچکچاتے ہوئے نالے کی طرف چل پڑی۔ وہ لڑکا اب بھی وہیں موجود تھا۔ اُس نے تجسس سے اَنا کی طرف دیکھا۔

اَنا نے دو ناؤ جو نسبتاً کم اچھی تھیں۔ اُس لڑکے کی طرف بڑھادیں۔ لڑکے کو یقین نہیں آرہا تھا کہ نیلے اسکرٹ والی وہ خوب صورت لڑکی اُس کو بلا رہی تھی۔ وہ تقریباً دوڑتے ہوئے اُس کے پاس پہنچا۔

"لو" وہ بغیر کسی تاثر کے بولی۔

لڑکے نے انھیں لے لیا اور چپ چاپ وہیں کھڑا رہا۔ اوپر کو منہ کیے ہوئے انا مڑی اور آہستہ سے اپنی ناؤ پانی میں چھوڑ دی۔

ناؤ پانی میں تیز رفتاری سے بہنے لگی۔ لڑکا وہاں کھڑا اُسے دیکھتا رہا۔ اُس کے ہونٹوں پر ہلکی سی

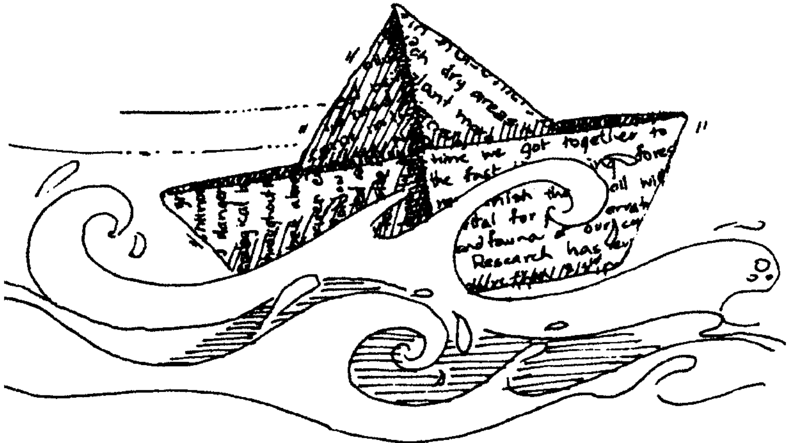
مسکراہٹ تھی۔ اَنا جانتی تھی کہ لڑکے کا ارادہ ناؤ کو پانی سے باہر کھینچ نکالنے کا نہیں ہے۔ وہ خوش ہو کر اُس آہستہ آہستہ ہچکولے کھاتی ناؤ کو پانی میں تیرتے ہوئے دیکھتی رہی!

اَنا خوشی سے چیخنے ہی والی تھی کہ اُس نے گھبرائی ہوئی آنکھوں سے دیکھا کہ ناؤ مٹی اور پتھروں کے ایک ڈھیر میں پھنس گئی ہے۔ پانی اُس سے ٹکرا رہا تھا اور دھیرے دھیرے اُس میں پانی بھرنے لگا۔ بجلی کی سی پھرتی سے لڑکا پانی کے بیچوں بیچ پہنچا اور ناؤ کو باہر نکال لایا۔

اُس نے پانی نکالنے کے لیے ناؤ کو اُلٹا کیا اور بنا کچھ بولے اُس کو انا کی طرف بڑھا دیا۔

انا نے ناؤ لے لی اور مسکرائی۔ لڑکے نے مسکراہٹ کا جواب ایک حسین مسکراہٹ سے دیا۔ انا گھومی اور بہت آہستہ سے ناؤ پانی میں ڈال دی۔ وہ تیزی سے تیرنے لگی اور پتھروں اور مٹی اور گھاس کے بڑے بڑے ڈھیروں کے پاس سے گزرتی گئی اور جلد ہی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

اَنا اور اُس لڑکے نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور مسکرا دیے۔



کھڑکی والا اجنبی

"یہ کیسے ہوا؟" روبی نے سوچا۔ یہ کتاب تو اُس کی تھی۔ اُس کو اس نے ابھی تک پڑھا بھی نہیں تھا۔ پھر وہ اُس آدمی کے پاس کیسے پہنچ گئی جو کھڑکی کے پاس بیٹھا تھا؟

کھڑکی والی سیٹ اُن کے کیبن کے بالکل سامنے تھی۔ روبی اور اُس کی ماں ایک اور عورت کے ساتھ بڑی سیٹ پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ یہ ایک پرانا سیکنڈ کلاس سلیپر کمپارٹمنٹ تھا۔ روبی کو یہ کمپارٹمنٹ بہت اچھا لگا تھا۔ اُس کو وہ راہداری بھی اچھی محسوس ہوتی تھی جو کیبنوں کو کھڑکی والی سیٹوں سے جُدا کرتی تھی جس میں کوئی بھی چہل قدمی کر سکتا تھا۔ روبی دوسرے کیبن میں اپنی سہیلی میتھو کے ساتھ گپ شپ کا لطف اٹھا رہی تھی۔ واپس آتے وقت کیبن کے دروازے پر جب اُس نے مڑ کر دیکھا تو اُسے وہ کتاب دکھائی دی۔

"جناب میری کتاب آپ کے پاس یہاں کیسے آگئی؟" روبی تقریباً چیختے ہوئے بولی۔

وہ شخص ٹس سے مس نہ ہوا۔ وہ اخبار پڑھنے میں مصروف تھا۔ جس نے اُس کا چہرہ اِدھر ادھر سے ڈھانپ رکھا تھا۔ اُس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس بات سے روبی کو طیش آگیا۔

"معاف کیجیے؟" اُس نے سنجیدگی سے کہا۔

"ہوں" اُس آدمی نے بغیر اوپر دیکھے جواب دیا۔

"اوہو آپ پڑھنے میں مصروف ہیں؟ سنیے، کیا میں اپنی کتاب واپس لے سکتی ہوں؟" روبی غصے میں بھری ہوئی تھی۔

"تمھاری کتاب؟ کون سی؟" اُس شخص نے ادھر اُدھر دیکھا۔

"ہاں! میری کتاب۔ یہ والی۔ پنج تنتر"۔

روبی نے کتاب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا جو چند دوسری کتابوں اور رسالوں کے درمیان اُس کے برابر میں رکھی ہوئی تھی۔

"کیا تمھیں یقین ہے، یہ تمھاری کتاب ہے؟" اُس نے پوچھا۔ اُس کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔ وہ اُس کی طرف دیکھتا رہا۔

"یہ میری بھی تو ہو سکتی ہے" اُس نے اُس کے جواب کا انتظار کیے بغیر مذاقیہ انداز میں کہا۔

"کیا وہ بچہ بن رہا ہے؟ بچوں کی کتاب اور اُس کی؟ شرارت پر اُترا ہوا ہے؟" اُس نے دل ہی دل میں سوچا۔

"ماں، دیکھو، جو کتاب منو چاچا نے مجھے اسٹیشن پر دی تھی۔ انھوں نے لے لی ہے"۔ روبی نے اپنی ماں کو آواز دی۔ ماں نے اُس کی آواز نہیں سنی۔ ریل بہت تیزی سے چل رہی تھی اور بہت شور ہو رہا تھا۔ روبی خود پر قابو نہیں رکھ سکی۔ جلدی سے کتاب اٹھاتی ہوئی ماں کی طرف لپکی "ماں کیا منو چاچا نے یہ کتاب مجھے نہیں دی تھی؟" روبی نے کتاب کو اوپر اٹھاتے ہوئے سوال کیا۔

"ہاں، یقیناً پھر کیا ہوا؟" ماں کو تعجب ہوا۔

"انھوں نے میری کتاب لے لی تھی۔ اب انھیں تعجب ہو رہا ہے کہ کتاب میری ہے؟" روبی کی آواز جذبات سے پُر تھی۔

"لیکن تم نے اسے کہاں رکھا تھا؟" ماں موقع محل کا اندازہ لگانا چاہتی تھی۔

"وہاں، اُدھر اپنے بیگ میں" روبی اپنی سیٹ کے کونے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔

ماں کو یقین نہیں تھا کہ وہ آدمی روبی کی غیر موجودگی میں کسی وقت اُن کی طرف کیبن میں آیا ہو۔ اُسے یاد نہیں آرہا تھا کہ اس آدمی نے ایسا کیا بھی تھا کہ نہیں۔ وہ تو اس کے برعکس پورے وقت اپنی سیٹ پر ہی رہا۔ اپنے مطالعہ میں بالکل غرق۔ شاید روبی کی طرح کتاب کا رسیا تھا، ماں نے سوچا۔ لیکن وہ کتاب منو نے روبی کو تحفے میں دی تھی یہ بھی ایک حقیقت تھی۔ اس بات میں کوئی شک نہیں تھا۔ "تمھیں معلوم ہونا چاہیے کہ سفر میں اپنی چیزوں کو کس طرح رکھنا چاہیے۔ اب بیٹھ جاؤ اور پڑھو اگر تمھارا دل چاہے"۔ روبی کی ماں کو کسی قسم کی بے قراری پسند نہیں تھی۔ سیٹ پر بیٹھی دوسری عورت مطمئن نہیں تھی۔ "آپ کو ریل میں ہر طرح کے لوگ ملتے ہیں!" اُس نے 'ہر طرح' پر زور دیتے ہوئے رائے زنی کی۔



کھڑکی پر بیٹھے ہوئے اُس آدمی نے اس بات کا کوئی اثر نہیں لیا۔ اُس کا انداز دوستانہ تھا۔ وہ بولا "اگر تمھارا خیال ہے کہ یہ کتاب تمھاری ہے تو تم ...... روبی نے اُسے بیچ میں ہی سختی سے روک دیا" یہ میری ہے، یقیناً، یہ میری بیچ تنتر ہے، بچوں کی کتاب، روبی نے کتاب کا کور دکھاتے ہوئے اُسے اونچا کیا، جیسا کہ وہ یہ ثابت کرنا چاہ رہی ہو کہ بچوں کی کتاب کو بچوں کے پاس ہونا چاہیے۔

"لیکن ......" وہ آدمی اُلٹ پلٹ کرتا ہوا بولا لیکن روبی کو غصّے کی حالت میں دیکھ کر کہا" ٹھیک ہے، تم اسے رکھ سکتی ہو، بے بی"۔ وہ خاموشی سے کھڑا ہوا اپنا سب سامان، رسالے اور کتابوں کو چھوڑ کر کمپارٹمنٹ سے باہر چلا گیا۔

'تم اسے رکھ سکتی ہو! تم اسے رکھ سکتی ہو، بے بی؟' اُس کا کیا مطلب ہے؟ روبی اب کوئی بچی نہیں رہی ہے! روبی پورے گیارہ سال کی ہے۔ وہ اب الہڑ چھوٹی سی بچی نہیں ہے۔ روبی اپنی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ کتاب کو کھولا لیکن اُس پر توجہ مرکوز نہ کر سکی۔ اُس کا چھوٹا سا دماغ درہم برہم تھا۔

اس دوران ٹرین نے رفتار پکڑلی۔ کچھ مسافروں میں حرکت ہوئی اور وہ اپنا سامان ٹھیک کرنے لگے۔ منزل قریب تھی۔ روبی نے کتاب کو احتیاط سے اپنی گود میں رکھ لیا۔ وہ اس کو کھونا نہیں چاہتی تھی! بڑی سیٹ پر بیٹھی عورت اُس کو غور سے دیکھ رہی تھی۔ ہمدردانہ لہجے میں بولی" آج کل اس طرح کے سب لوگ شریفوں کے لباس میں گھومتے ہیں! اُنھیں طور طریقے نہیں آتے"۔

اُس آدمی نے واپس آتے ہوئے ادھورا جملہ سنا۔ اُس نے ایک لمحہ توقف کیا۔ اپنا سامان باندھا اور کمپارٹمنٹ سے چلا گیا۔ شاید دروازے پر اسٹیشن کا انتظار کرنے کے لیے۔ اُسے ایسی کیا جلدی تھی؟ وہ چلتی ہوئی ٹرین سے کود تو نہیں سکتا تھا۔ سب سے زیادہ ناپسندیدہ آدمی! روبی غور وفکر میں ڈوب گئی۔

ٹرین اسٹیشن میں داخل ہو رہی تھی۔ ڈیڈی کسی بھی لمحے کمپارٹمنٹ میں داخل ہو جائیں گے۔ روبی کو اترنے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ اُس نے اپنا بیگ اُٹھایا۔ اُس میں اپنی چھوٹی چھوٹی چیزیں ڈالنے لگی۔

"ممی! دیکھیے۔ پلیز!"

"یہ کیا ہے؟" ماں نے سوال کیا۔ وہ کھڑی ہو گئیں۔

"یہ کیا ہے میری بیٹی؟" انھوں نے سوال دوہرایا۔

"دیکھیے۔ میری کتاب یہاں ہے! میری پنج تنتر کی کتاب یہاں میرے بیگ میں ہے"۔ اُس کے ہاتھ میں جو کتاب تھی وہ اس کی اپنی نہیں تھی۔

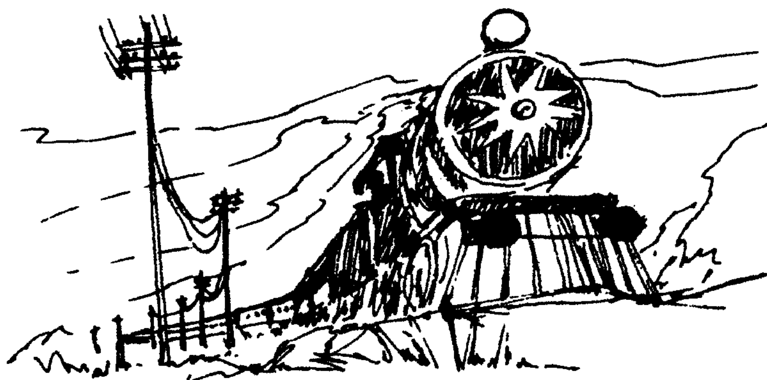
"کیا تم نے اُس کو پہلے نہیں دیکھا۔ لڑکی؟ تم نے کتنی غلط بات کی! یہ کتاب اُس کے اپنے بچوں کے لیے ہو سکتی ہے"۔

بڑی سیٹ پر بیٹھی عورت اترنے کے لیے تیار تھی۔ اُس نے حقارت سے روبی کی طرف دیکھا۔

"اُس آدمی کو اس سے پوری بات کرنی چاہیے تھی۔ اُسے صاف صاف بتا دینا چاہیے تھا۔ اُس کو بچی سے بے تکلف کہہ دینا چاہیے تھا"۔ ماں نے بیچ میں دخل دیتے ہوئے کہا۔

"اوہ، وہ بے چارہ آدمی!" روبی نے اپنی ماں کی دلیل میں اضافہ کرتے ہوئے اُس کی تائید کی۔

روبی حیران و پریشان تھی۔ پنج تنتر کی دو کتابیں اپنے دونوں ہاتھوں میں اٹھائے ہوئے وہ اپنے آنسو روکنے کی پوری کوشش کر رہی تھی۔ اُسے افسوس تھا کہ کھڑکی والے آدمی سے 'ساری' نہ کہہ سکی۔



ایک آدمی کا کام

لان میں کھیلتے ہوئے راہل نے سنیل کو دیکھا جو گھر سے اپنے بلّے، وکٹ اور گیند لیے نکل رہا تھا۔ وہ بھاگتا ہوا اُس کے پاس پہنچا اور پوچھا "سنیل بھیّا! کیا تم کرکٹ کھیلنے جا رہے ہو؟"

"ہاں"

"کیا میں بھی تمھارے ساتھ چل سکتا ہوں؟" راہل نے اشتیاق سے پوچھا۔

"ارے، نہیں" "تم چھوٹے ہو۔ ہم بڑے لڑکے بہت بُری طرح کھیلتے ہیں"۔

"اچھے بھیّا! اگر میں کھیل نہیں سکتا تو کچھ تو کر سکتا ہوں۔ میں تم لوگوں کے لیے گیند پکڑوں گا"۔ راہل نے اصرار کیا۔ وہ آسانی سے ہار ماننے کے لیے تیار نہیں تھا۔

"نہیں۔ ہم کارک کی گیند سے کھیلتے ہیں جو بہت سخت ہوتی ہے۔ تمھیں چوٹ لگ جائے گی"۔ کرکٹ کے سامان کو اپنی سائیکل پر رکھتے ہوئے سنیل سے کہا اور تیزی سے چلا گیا۔

راہل اس کو تعریفی نظروں سے دیکھتا رہا۔ 'اوہ! وہ سائیکل کتنی تیز چلا سکتا ہے!' اس نے سوچا۔

سنیل اُس کا ہیرو تھا اور وہ اُس کی پرستش کرتا تھا۔ اُس کے لیے یہ ایک ناپسندیدہ بات تھی کہ سنیل ہمیشہ اُسے بچے کی طرح سمجھتا تھا اور اس بات سے اُسے چڑ تھی۔ وہ اپنے آپ سے بولا 'میں اب بچہ نہیں ہوں۔ میں اگلے مہینے نو سال کا ہو جاؤں گا۔ میں بس اسٹاپ سے اکیلا گھر آجاتا ہوں۔ کبھی کبھی ماں مجھے مدر ڈیری سے دودھ لانے کے لیے بھیج دیتی ہے اور سب سے بڑی بات یہ کہ میں پیڑ پر بھی چڑھ سکتا ہوں جو کہ سنیل بھیّا بھی نہیں کر سکتے۔

راہل پہلی منزل پر رہتا تھا جب کہ سنیل اُسی بنگلے کی نچلی منزل میں رہتا تھا۔ راہل اپنے ماں،

باپ اور دادی کے ساتھ رہتا تھا۔ سنیل، جو چودہ سال کا تھا۔ اپنے والدین، دادا، دادی اور ایک بڑے بھائی کے ساتھ رہتا تھا۔ اُس کے والد کی شہر میں جواہرات کی ایک بڑی دکان تھی۔

کیوں کہ راہل کے ماں اور باپ دونوں کام پر جاتے تھے، وہ اپنا وقت زیادہ تر اپنی دادی کے ساتھ گزارتا تھا۔ اڑوس پڑوس میں راہل کی عمر کے چند ہی بچے تھے۔ سنیل کبھی کبھی راہل کے ساتھ کھیل لیتا تھا۔

ایک روز سنیل نے راہل سے اعتماد سے کہا "میں نے کل اسکول میلے میں ٹینس کی ایک گیند جیتی ہے۔ وہ میں نے تمھارے لیے رکھ دی ہے۔ تمھارے لیے اُس سے کرکٹ کھیلنا اچھا رہے گا"۔

"لیکن بھیا! میں اب چھوٹا بچہ نہیں ہوں"۔ راہل ایک دم سے بھنا کر بولا۔

"ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔ اتنے جوشیلے مت ہو"۔

سنیل اُس کے اس طرح اچانک پھٹ پڑنے سے مزہ لے رہا تھا۔ میں آج سہ پہر میں خالی ہوں۔ تم آنا۔ ہم مونوپولی (Monopoly) کھیلیں گے۔ تم میرے ساتھ دوپہر کا کھانا کھا سکتے ہو"۔

"اچھا ٹھیک ہے۔ میں ابھی اوپر جاتا ہوں اور اپنے کپڑے تبدیل کرتا ہوں"۔

راہل تیزی سے سیڑھیاں چڑھتا ہوا اوپر پہنچا۔ اسکول کا بستہ اتار کر پھینکا اور اپنے کپڑے بدلے۔

ٹی شرٹ اور موزے پہنتے ہوئے وہ زور سے بولا

"دادی" میں سنیل بھیا کے گھر مونوپولی کھیلنے جارہا ہوں۔ میں دوپہر کا کھانا وہیں کھاؤں گا"۔ یہ سب کرنے میں صرف چند منٹ لگے اور جلدی ہی وہ سنیل کے گھر کے سامنے والے دروازے پر تھا۔ اُس نے گھنٹی بجائی اور انتظار کرنے لگا۔ لیکن کسی نے دروازہ نہیں کھولا۔ اُس نے دوبارہ زیادہ دیر تک گھنٹی بجائی۔ اُس نے دروازے سے اپنے کان لگائے اور بند دروازے کے پیچھے اُسے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ دروازہ اب بھی بند تھا۔ 'عجیب بات ہے' راہل نے سوچا۔ ابھی پانچ منٹ پہلے ہی تو سنیل بھیا نے مجھے بلایا تھا اور اب دروازہ نہیں کھول رہے ہیں۔'

وہ پیچھے کی طرف دوڑا۔ اُس نے دیکھا کہ دروازہ اندر سے بھی بند ہے۔ تب وہ سنیل کے کمرے کی بائیں طرف بھاگا۔ وہ کھڑکی پر گیا جو بند تھی اور جس پر کالا کاغذ چڑھا ہوا تھا۔ اچانک اُس نے ایک آواز سنی۔

"کون ہے، وہاں کون ہے؟" یہ سنیل کی آواز تھی۔ لیکن وہ بہت دھیمی آواز میں بول رہا تھا۔

"یہ میں ہوں راہل' تم نے مجھے بلایا اور اب......"

"شش......" سنیل جلدی سے بیچ میں ہی بولا۔ "راہل تمھیں ہماری مدد کرنا ہے۔ یہاں اندر ڈاکو ہیں"۔

"ڈاکو ؟ کیا اُن کے پاس پستول ہیں؟"

"ہاں 'اُن کے پاس ہیں۔ جب میں یہاں آیا وہ یہاں موجود تھے۔ جیسے ہی میں اندر داخل ہوا انھوں نے مجھے پکڑ لیا اور میری دادی کے ساتھ مجھے اس کمرے میں بند کر دیا"۔

"کیا تمھیں ڈر لگ رہا ہے"۔

"نہیں، بالکل نہیں"۔ راہل بولا۔

"پھر پولیس کو اطلاع کر دو۔ کیا تم ایسا کر سکتے ہو؟"

"اوہ، یقیناً"۔

کنارے کنارے چلتے ہوئے راہل آہستہ سے دروازے سے باہر آگیا، پھر وہ اپنی پوری طاقت سے بھاگا۔

جب وہ پولیس اسٹیشن بوتھ پر پہنچا، اُس کا سانس پھولا ہوا تھا۔ اُس نے پولیس والوں کو دیکھا اور فوراً ہی بولنا شروع کر دیا۔

"جناب، برائے مہربانی میرے ساتھ چلیے۔ میرے گھر ڈاکو آگئے ہیں۔ میرا مطلب ہے میرے دوست کے گھر میں۔ میرا مطلب ہے سنیل بھیا کے گھر......"

"تم کیا گپ مار رہے، بچے؟" ہمارا وقت خراب مت کرو، ہمارے پاس تمھاری شرارتوں کے لیے وقت نہیں ہے"۔ اس گرمی میں آوارہ پھرنے کے بجائے اپنے گھر واپس جاؤ"۔ ایک پولیس والا بولا اور اپنا رجسٹر لکھنے میں لگ گیا۔ دوسرا پولیس والا ٹیلی فون پر بات کر رہا تھا۔

'ہر لمحہ قیمتی ہے۔' راہل نے پریشان ہوتے ہوئے سوچا۔ اُس نے چاروں طرف نظر ڈالی اور دیکھا کہ کاؤنٹر پر ایک گھڑی رکھی ہے۔ اُس نے گھڑی اُٹھائی اور بھاگنا شروع کر دیا۔ ایک منٹ کے لیے پولیس والے چکرا گئے۔ دو پولیس والے راہل کے پیچھے چیختے ہوئے دوڑے۔ "ارے، تم چور، گھڑی واپس کر دو نہیں تو ہم تمھیں جیل میں بند کر دیں گے"۔

سڑک خالی پڑی تھی۔ اس لیے کوئی دوسرا اس کا پیچھا کرنے میں شامل نہیں ہوا۔ جب تک راہل گھر کے دروازے تک پہنچا پولیس والوں نے اُسے پکڑ لیا۔

"جناب، مہربانی کر کے غصہ مت ہوئیے۔ میرا ارادہ آپ کی گھڑی چرانے کا بالکل نہیں تھا۔ میں نے یہ ترکیب صرف آپ کو یہاں تک لانے کے لیے کی تھی"۔

پولیس والوں کا غصہ اب کچھ کم ہوا۔ ایک نے اپنی جیب سے نوٹ بک اور پین نکالے اور کچھ لکھا۔ پھر اس نے وہ صفحہ پھاڑ کر راہل کو دیا اور بولا "بیٹے 'دوبارہ سے بوتھ واپس دوڑ کر جاؤ جتنا تیز تم دوڑ سکتے ہو اور یہ وہاں پولیس والے کو دے دو۔ مجھے بتاؤ وہ گھر کون سا ہے؟

"سیدھے گھر کے بائیں طرف جاؤ اور وہاں کھڑکی پر کھٹکا کرو۔ سنیل بھیا وہاں پر ہیں"۔ راہل نے جواب دیا اور پوری رفتار سے چوکی کی طرف بھاگا۔ کچھ ہی منٹوں میں وہ وہاں دوبارہ موجود تھا۔

پولیس والا راہل کو دیکھ کر چلایا۔ "اے، شریر لڑکے وہ گھڑی کہاں ہے؟"

"اوہ" میرا یقین کیجیے، میں کوئی چور نہیں ہوں۔ اس کو جلدی سے پڑھ لیجیے، آپ کے دوست نے یہ بھیجا ہے"۔

راہل نے پولیس والے کو وہ پرچا دیا اور بے چینی سے انتظار کرنے لگا۔ جیسے ہی پولیس والے نے اُسے پڑھا وہ حرکت میں آ گیا۔ اُس نے وائرلیس پر کوئی پیغام دیا۔ جلدی ہی پولیس کا ایک اُڑن دستہ وہاں پہنچ گیا۔ راہل اور وہ پولیس والا دونوں جیپ میں سوار ہو گئے۔ جب وہ سنیل کے گھر پہنچے تو پہلے ہی وہاں موجود پولیس والے انھیں مل گئے اور انھیں اطلاع دی کہ "ڈاکو ابھی تک اندر ہیں، اُن میں سے دو پستولوں سے لیس ہیں۔ وہ سب چار ہیں"۔

پولیس نے خاموشی سے گھر کی ناکہ بندی کر لی۔

کچھ دیر بعد سامنے کا دروازہ کھلا اور ایک شخص پستول لیے برآمد ہوا۔ اُس نے احتیاط سے چاروں طرف دیکھا اور کسی کو نہ پا کر اپنے ساتھیوں کو باہر آنے کا اشارہ کیا۔ تین اور آدمی باہر




POLICE

آ ئے۔ ایک کے پاس ٹاٹ کا تھیلا تھا دوسرے شخص کے پاس ایک پستول تھا، اور تیسرا خالی ہاتھ تھا۔ جیسے ہی انھوں نے دروازے کی طرف بڑھنا شروع کیا۔ انسپکٹر چلایا "پکڑو!" اور پولیس پارٹی نے حملہ کر دیا۔

ڈاکو جو اس اچانک حملے کے لیے بالکل تیار نہ تھے۔ اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھے۔ جلدی ہی ان پر قابو پالیا گیا اور انھیں نہتا کر دیا گیا پھر پولیس نے انھیں گرفتار کر کے جیپ میں ٹھونس دیا۔ پولیس والے جو ڈاکوؤں کے ساتھ تھے جیپ میں ہی رہے اور باقی لوگ گھر کے اندر گئے۔ انھوں نے سنیل اور اُس کی دادی کی رسیاں کھولیں پھر وہ دوسرے کمرے میں گئے وہاں انھوں نے سنیل کی ماں اور دادا کی رسیاں کھولیں۔ اُس کے دادا ڈاکوؤں کے ساتھ ہاتھاپائی میں زخمی ہوگئے تھے۔ کیوں کہ ڈاکوؤں نے سنیل کے گھر کی ٹیلی فون لائن کاٹ دی تھی اس لیے ایمبولینس کو وائرلیس کے ذریعے بلایا گیا۔

اسی دوران وہ سب ڈرائنگ روم میں جمع ہوئے۔ راہل نے پوری روداد سنائی۔ بیچ کی باتوں کو سنیل اور اُس کی ماں نے پورا کر دیا۔ پولیس انسپکٹر نے راہل کی پیٹھ تھپتھپائی اور کہا" آپ سب کو اپنے بچائے جانے کے لیے اس چھوٹے بچے کا شکریہ ادا کرنا چاہیے۔ یہ اُس کی حاضر دماغی تھی کہ آپ لوگ بچ سکے"۔

سنیل راہل کے پاس آیا اور بولا "ارے، میں نے تمھیں ہمیشہ ایک چھوٹے بچے کی طرح سمجھا ، لیکن تم ایک بہادر لڑکے ہو۔ تم نے یقیناً ایک بڑے مرد کا کام کیا ہے"۔

راہل کے لیے یہ سب سے زیادہ خوشگوار لمحہ تھا۔ اب وہ سنیل بھیا کے لیے کوئی چھوٹا بچہ نہ تھا۔ اُس کا چہرہ خوشی سے دمک رہا تھا۔ سنیل بھیا، کیا میں اب آپ کے ساتھ کرکٹ کھیلنے کے لیے آسکتا ہوں؟" اُس نے شرماتے ہوئے سوال کیا۔

سنیل نے ایک مسکراہٹ کے ساتھ ہاں میں سر ہلایا۔

راجو کی گائے

'آں! آں؟ تلسی، گائے کی آواز، دور سے سنائی دی۔ لیکن راجو اپنی جگہ سے نہیں ہلا۔ آواز تیز ہوتی چلی گئی اور ایسا لگا جیسے تلسی فارم ہاؤس کی طرف آرہی ہے۔ راجو نے کروٹ بدلی اور کمبل اپنے سر تک کھینچ کر اوڑھ لیا۔

"تمھیں اسکول کے لیے دیر ہو رہی ہے" اُس کی ماں چیخی۔ اُس نے راجو کو ہلکے سے ہلایا اور اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ "موسم بہار کی اس سہانی صبح کو تمام قدرت جاگ گئی ہے۔ چلو، اُٹھو!" دودھ اُبلنے ہی والا تھا! اس لیے دو ر سوئی کی طرف لپکی اور راجو نے ایک مرتبہ پھر اپنا منہ کمبل سے ڈھک لیا۔

راجو کا باپ شام سنگھ کھیت سے واپس آچکا تھا۔ وہ ایک چھوٹے اسٹول پر بیٹھا آرام کر رہا تھا۔ اُس کی کہنیاں اُس کے گھٹنوں پر تھیں۔ اُس نے اپنا سر اپنی ہتھیلیوں میں تھاما ہوا تھا۔

"آج کیا بات ہے؟" راجو کی ماں نے اُس سے پوچھا۔

"میں بیمار ہوں، بہت زیادہ بیمار۔ رات کو میں ایک لمحہ بھی نہیں سو پایا۔ یہ کہتے ہوئے وہ کھڑا ہو گیا اور بغل والے کمرے میں چلا گیا۔ تب لکڑی کے فرش پر اپنا پاؤں پٹختے ہوئے غصے سے تقریباً چلاتے ہوئے بولا "ہم اس گائے کی تمام رات کی با، با سے تنگ آگیا ہوں۔ میں اس سے چھٹکارا حاصل کر رہا ہوں، میں اسے رام جی کو، جب وہ آج یہاں آئے گا دے دوں گا"۔

راجو نے اپنے نیچے سے زمین کھسکتے ہوئے محسوس کی۔ "آپ نے کیا کہا بابو جی۔' اس نے پوچھا۔

"میں یقیناً تلسی کو تمھارے چچا کو دے رہا ہوں"۔ اُس کے باپ جواب دیا۔

"لیکن کیوں؟" اُس نے سوال کیا۔

"میں اس کی با، بااب زیادہ برداشت نہیں کر سکتا۔ وہ ایک پریشان کن چیز بن گئی ہے"۔

راجو بد حواس سا ہو گیا، پھر اُسی نے ہمت کی اور التجا کی۔

"لیکن، بابو جی! ابھی تو وہ بہت چھوٹی ہے۔ وہ صرف ڈیڑھ دو سال کی ہے۔ وہ جلدی ہی دوسری گایوں کی طرح برتاؤ کرنا سیکھ لے گی"۔ اس کے باپ نے بھٹوں کا تھیلا اُٹھایا اور باہر برآمدہ میں چلا گیا۔ راجو اس کے پیچھے چیختا ہوا دوڑا "لیکن بابو جی...... "اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا اُس کا باپ مڑا اور اُس کی طرف حقارت سے دیکھتا ہوا تالاب کی طرف چلا گیا۔

شرمندہ! مایوس اور افسردہ راجو نے کپڑے تبدیل کیے اپنا بیگ اٹھایا اور تیزی سے لکڑی کے دروازے سے باہر نکل گیا۔ وہ اپنی ماں سے جو ایک ہاتھ میں دودھ کا گلاس اور دوسرے میں کھانے کا ڈبہ لیے کھڑی تھی، بچ کر نکلا۔

"ٹھہرو راجو۔ ٹھہرو! میں نے تمھارے لیے کچھ مٹھائی رکھی ہے"۔ راجو نے اُس کی طرف کوئی توجہ نہیں دی۔

سڑک پر پہنچ کر راجو کی رفتار دھیمی پڑ گئی اور اُس نے محسوس کیا جیسے اُس کا جسم اتنا بھاری ہو گیا ہے کہ اُس کی ٹانگیں اُس کے بوجھ کو نہیں سنبھال پا رہی تھیں۔ اس لیے وہ ایک جنگلی درخت کے باہر نکلے ہوئے تنے پر بیٹھ گیا۔ خود کو خالی اور بے کار محسوس کرتے ہوئے اُس نے بہتے ہوئے پانی میں کنکر پھینکنا شروع کر دیے۔

اچانک وہ اُچھل کر کھڑا ہو گیا۔ اُس نے ہوا میں اپنا گھونسہ لہرایا اور زور سے چلایا "میں نے پالیا، میں نے پالیا" اور تیزی سے اپنے اسکول چل دیا۔

وہ اپنی سیٹ پر خاموشی سے بیٹھ گیا۔ اُس کے ٹیچر بلیک بورڈ پر کچھ لکھنے میں مصروف تھے۔ ایک مرتبہ پھر وہ گہرے خیالات میں کھو گیا، تبھی کسی نے اُسے مخاطب کیا "کیا بات ہے راجو؟" "کچھ نہیں جناب"

"پھر تم کام کیوں نہیں کر رہے ہو؟" راجو ایک لمحے کے لیے خاموش کھڑا رہا پھر آہستے سے بولا، "مجھے افسوس ہے سر"۔ اور وہ بے دلی سے سوال حل کرنے بیٹھ گیا"۔

جیسے ہی آخری گھنٹی بجی راجو کلاس سے باہر آیا اور تیزی سے اور بلکہ تقریباً بھاگتا ہوا گھر کی طرف چل پڑا۔ فارم کے دروازے پر ہی اسے تلسی مل گئی۔ اُس نے باڑی میں بستہ پھینکا اور آگے بڑھ کر تلسی کی گردن میں اپنی باہیں ڈال کر اُس کی پیشانی کے بوسے لیتے ہوئے بولا "اچھا تو تم ابھی تک یہاں ہو۔ میری اچھی! مجھے چھوڑ کر مت جانا۔ اپنے راجو کو کبھی مت چھوڑنا"۔ تلسی سیدھی اور سدھی ہوئی تھی۔ وہ آنکھیں بند کیے، پیار کی مٹھاس کا مزہ لیتے ہوئے بے حس و حرکت کھڑی رہی۔

راجو چلاتا ہوا رسوئی کی طرف بھاگا۔ "اماں، اماں 'تو بابو جی نے اپنا ارادہ بدل دیا ہے؟"

"نہیں رام جی کو کچھ کام تھا۔ وہ اسے کل لے جائے گا؟

راجو چپ چاپ پیچھے ہٹا۔ اُس نے غم زدہ ہو کر اپنا بستہ اُٹھایا اور آہستہ سے اپنے بیڈ روم میں چلا گیا۔ وہ ایک کتاب لے کر بیٹھ گیا اور اُسے پڑھنے لگا۔

رات ہو چکی تھی اور فارم پر سوائے راجو کے سب سو چکے تھے۔ اچانک اُسے تلسی کی آواز 'ماں، ماں' سنائی دی۔ وہ فوراً ہی بستر سے اٹھ کھڑا ہوا اور ماچس اور ایک موم بتی لے کر دوڑا۔

راجو نے موم بتی جلائی اور چھپر کا دروازہ کھولا۔ اُس کی نظر تلسی پر پڑی۔ موم بتی اُس کے ہاتھ سے گر گئی اور اُس کے منہ سے چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ پھر اچانک وہ اوپر کی طرف سیڑھی سے اپنے باپ کے کمرے کی طرف دوڑا۔ اس نے اپنے باپ کو جھنجوڑا۔

"کیا بات؟ کیا بات ہے؟" شام سنگھ ہکلایا۔

"بابو جی! میری تلسی، میری تلسی، اُس کو بچائیے"۔ راجو نے کہا اور واپس چھپر کی طرف بھاگا۔ اُس کا باپ بھری ہوئی بندوق اور لال ٹین لے کر اُس کے پیچھے آیا۔

"راجو، رکو، ٹھہرو، چیتا تمھیں مار دے گا" اُس کے باپ نے گرجدار آواز میں پکارا۔

"مہربانی کر کے شور مت کیجیے"۔ راجو نے جواب دیا۔

جیسے ہی شام سنگھ چھپر کے دروازے پر پہنچا۔ وہ پیچھے ہٹ گیا۔ لال ٹین کی مدھم روشنی میں وہ تلسی کو اچھی طرح دیکھ سکتا تھا۔ وہ خوف زدہ ہو گیا اور بھنچی ہوئی آواز میں بولا "اوہ! یہ تو دھامن سانپ ہے۔ یہ سانپ چور ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تم نے مجھے شور نہ کرنے کے لیے کہا" اور یکایک اپنی بندوق اُس کی طرف تان لی۔ راجو اچھلا اور اپنے دونوں ہاتھوں سے بندوق



کو پکڑ لیا۔ "نہیں، بابو جی ایسا مت کیجیے، تلسی زخمی ہو جائے گی یا دھامن اُس کو ڈس لے گا"۔

"تم ٹھیک کہتے ہو، میرے بیٹے، آؤ ہم یہاں سے چلیں" اُس کا باپ دھیمے سے بولا۔

وہ بڑا دھامن سانپ جو تلسی کی پچھلی ٹانگوں کے گرد لپٹا ہوا تھا اور اُس کے تھنوں سے دودھ پی رہا تھا، خاموشی سے نیچے پھسلا اور چھپر میں ایک سوراخ میں غائب ہو گیا"۔

شام سنگھ نے چھپر کا دروازہ بند کر دیا اور بولا "اسی لیے تو گائے روز بہ روز دُبلی اور کمزور ہوتی جا رہی تھی"۔

"ہاں، بابو جی، اور خوف کی وجہ سے رات بھر 'باہ، باہ' چلاتی رہتی تھی"۔ ہم بھی کتنی غلطی پر تھے" راجو نے لقمہ دیا۔ دونوں یہی باتیں کرتے ہوئے اور فیصلہ کرتے ہوئے سو گئے کہ اگلے دن سپیرے کو بلا کر سانپ سے چھٹکارا پا لیں گے۔

اگلی صبح راجو جلدی ہی اٹھ گیا۔ اُس کی ماں نے اُس کو دیسی پنیر کے ساتھ کچھ روٹیاں اور گرم سبز چائے دی اور راجو نے اُس کو نگل لیا اور جلدی میں اپنی زبان جلالی۔ پھر وہ اپنے باپ کے ساتھ سپیرے کو بلانے چل دیا، جو کہ تقریباً دو میل کے فاصلہ پر ایک چھوٹی پہاڑی پر سڑیل سی جھونپڑی میں رہتا تھا۔

سپیرا بغیر کسی ہچکچاہٹ یا سودے بازی کے اُن کے ساتھ چلنے کے لیے تیار ہو گیا۔ ہرے کپڑوں میں ملبوس، لمبی آستینوں والی سفید گندی قمیص، کالی جیکٹ اور لال صافہ پہنے، سپیرے نے ڈنڈیوں سے بنی اپنی ٹوکری اپنے انگوچھے میں رکھی اور اُسے اپنے چوڑے کندھے پر لٹکا لیا اور اپنی دو چھنگی چھری لیتے ہوئے اُن کے ساتھ ننگے پیروں پہاڑی سے نیچے اترنے لگا۔

راستہ میں گھر واپس جاتے ہوئے جوش میں بھرے راجو نے اپنی پہاڑی زبان میں سینکڑوں سوالوں کی بوچھار کر دی اور اُس کا باپ ایک مرتبہ بھی اُس پر غصہ نہیں ہوا۔

"اس آدمی نے آپ سے کوئی سودے بازی نہیں کی، بابو جی؟"

راجو نے سوال کیا۔

"نہیں، بیٹے، آج اُس کے لیے خوشی کا دن ہے" اس کے باپ نے جواب دیا۔

"کیوں!"

"کیوں کہ "اُس کے سانپوں کے خاندان میں یہ ایک اضافہ ہوگااور وہ پیسے اور سامان کی شکل میں زیادہ کمائے گا"۔

"بابو جی، اُس نے صندوق کے بجائے ڈنڈیوں سے بنی ٹوکری اپنے ساتھ کیوں لی؟"

"اس طرح کی ڈنڈیوں سی بنی ٹوکری میں قیدی سانپ کے لیے ہوا جانے کے لیے سوراخ ہوتے ہیں"۔اُس کے باپ نے وضاحت کی۔

"بابو جی، اس کی چھڑی بھی عجیب ہے"۔

"ہاں، یہ ایک دو چھنکی چھڑی ہے۔ ہندوستانی سپیرے عام طور پر سانپوں کو ہاتھوں سے پکڑتے ہیں۔ لیکن بڑے سانپ یا راجہ کوبرا کو قابو میں کرنے کے لیے وہ بعض اوقات چھڑی کا استعمال کرتے ہیں"۔

"کیا دھامن سانپ خطرناک ہوتے ہیں؟"

"نہیں، نہیں، دھامن سانپ بڑے ہوتے ہیں لیکن زہریلے نہیں ہوتے اور کبھی کبھی کاٹتے ہیں جب تک کہ انھیں اشتعال نہ دلایا جائے۔ یہ چور ہوتا ہے اور اسے دودھ چرانا پسند ہے۔ یہ چڑیا، مرغیاں بھی پکڑتا ہے اور جھاڑیوں سے انڈے چراتا ہے اور مینڈھکوں اور چوہوں کا شوقین ہوتا ہے۔اسی لیے لوگ اس کو چوہا سانپ کہتے ہیں"۔اُس کے باپ نے جواب دیا۔

سپیرا جو اُن کی باتیں سن رہا تھا، بولا "زہریلے سانپ بدمعاش ہوتے ہیں۔ جھاڑیوں میں، گھاس میں اور پتھروں کے نیچے چھپ جاتے ہیں۔ اُنھیں جو بھی چیز ملے، اُسے ڈسنے کی خواہش ہوتی ہے۔ لیکن غیر زہریلے سانپ سیدھے دوڑتے ہیں اور کبھی کبھار ہی کاٹتے ہیں۔ لیکن اگر کوئی کاٹ بھی لے تو انسان مرتا نہیں ہے"۔

باتیں چلتی رہیں اور وہ جلدی ہی فارم پہنچ گئے۔ جیسے ہی آس پاس کے کھیتوں میں خبر تیزی سے پہنچی ایک بڑی بھیڑ وہاں اکٹھا ہو گئی۔

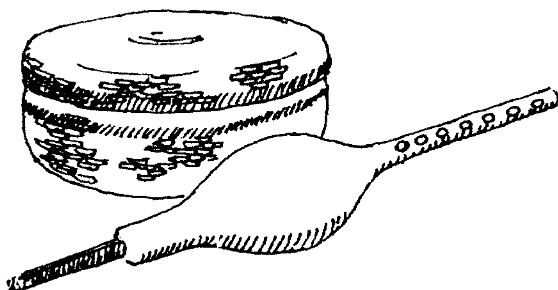
سپیرے نے اپنی ٹوکری اور بین نیچے رکھی۔ وہ زمین پر چوکڑا مار کر بیٹھ گیا اور کچھ منتر پڑھنے لگا۔ پھر اٹھ کر چھپر کا دروازہ کھول دیا۔ وہاں چوہوں کے بہت سے سوراخ تھے، لیکن اُس کا نشانہ صرف ایک دھول بھرا سوراخ تھا۔

اُس نے اپنی چھڑی ایک دو مرتبہ سوراخ میں گھسائی اور وہاں سے مٹی ہٹائی۔ اُس نے اپنے

بائیں ہاتھ سے اُس کی دم پکڑ کر سانپ کو باہر کھینچ لیا۔ اس نے فوراً ہی اپنی بین بجانا شروع کر دی۔ سانپ نے اپنا سر اُٹھایا اور بین پر ڈنک مارنے کی کوشش کی۔ وہ غصہ میں لگ رہا تھا۔

سپیرے نے لنگور کی طرح چھلانگ لگائی پھر یکایک اُس نے سانپ کو اپنے سیدھے ہاتھ سے اُس کی گردن سے پکڑ کر سختی سے دبایا اور اُس کو ایک رسّی کی طرح سیدھا اوپر اُٹھالیا۔ اُسے لے کر اُس کو اُنھیں دکھانے کے لیے اُس نے بھیڑ کا چکر لگایا۔ پھر اُسے اپنی ڈنڈی والی ٹوکری میں ڈال لیا۔ سب نے اُسے پیسے یا چیز کی شکل میں کچھ نہ کچھ دیا اور وہ جلدی ہی مسکراتا ہوا چلا گیا۔

راجو بھاگا ہوا احاطہ کے پار تلسی کے پاس گیا اور اُس کو اپنی باہوں میں پکڑتے ہوئے محبت سے بولا "تلسی تم میرے ساتھ ہمیشہ رہو گی"۔



جہاز کے عرشے پر

میں اپنا منہ جہاز کے روشن دان کے پاس لے گیا۔ پورٹ سوئز کی روشنیاں دور سے چمک رہی تھیں۔ جوں جوں ہم بندرگاہ کے نزدیک پہنچ رہے تھے وہ زیادہ چمک دار اور بڑی ہوتی جا رہی تھیں۔ ہمارا اسامانی جہاز 'کرسٹل' نہایت ہوشیاری سے ترنوں کے درمیان سے، جو ہمارا راستہ روشن کیے ہوئے تھے، اپنا راستہ بناتا ہوا جا رہا تھا۔ وہ تیرتی ہوئی کشتیوں، پھیلے ہوئے مچھلی پکڑنے کے جالوں، اور لنگر ڈالے جہازوں کے نزدیک سے ہوتے ہوئے گزر رہا تھا۔ آخر کار، وہ لنگر انداز ہوا اور ایک کپکپاہٹ کے ساتھ رُک گیا۔

میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ میرے اندر متلی کی سی جو کیفیت تھی وہ تیزی سے ختم ہوتی جا رہی تھی۔ اپنی چھٹیوں کے پہلے ہفتہ میں ہی میں سمندری متلاہٹ کا شکار ہو گیا تھا! میں جہاز کے عرشے پر بھی ڈول رہا تھا!

کیبن کا دروازہ زور سے کھلا اور میرے والد کیپٹن سونی، تیزی سے اندر داخل ہوئے۔ اپنی ٹائی ڈھیلی کرتے ہوئے انھوں نے اپنا کوٹ اُتار پھینکا۔

"کیا بات ہے، اجے، ابھی تک جاگ رہے ہو؟" انھوں نے اپنا سر بے صبری سے ہلایا "اس سے پہلے کہ کل ہمارا سفر ختم ہو ہمارے پاس ایک پورا دن یہاں رُکنے کے لیے ہے۔ ہم پہلے ہی طے شدہ پروگرام سے پیچھے چل رہے ہیں!"

میں خوشی سے کھل پڑا، "او ہو۔ بہت اچھا ڈیڈی! ہر شخص کو مزہ بدلنے کا موقع مل جائے گا!" ویڈیو شو، بینگو، اور ہاں۔ عرشے پر چٹپٹا کھانا، ایسی تمام چیزیں میرے خیال میں گھوم گئیں۔

لیکن ڈیڈی کا موڈ اچھا نہیں تھا۔ "بیٹے، اب بتیاں بجھا دو...... گیارہ بج چکے ہیں اور ہمارے پاس اگلا پورا دن ہے......"

وہ تھکے ہوئے تھے اور تقریباً فوراً ہی گہری نیند میں چلے گئے۔ میں ایک کونے میں بچھے اپنے بستر پر کروٹیں بدلتا رہا اور اہرامِ مصر اور فرعونوں کے بارے میں سوچتا رہا۔ بہر حال ہم کل نہر سوئز سے گزر رہے ہوں گے۔

میں نے بے چینی میں کمبل کو اُتار پھینکا۔ اب موسم گرم ہو چکا تھا اور میرے پیٹ کی بے چینی بھی کم نہیں ہوئی تھی۔ رات کا کھانا جلدی ہی لگا دیا گیا۔ میں نے زیادہ نہیں کھایا، کیوں کہ اُبلی ہوئی گو بھی اور پالک بے مزہ تھے۔

میں اُٹھ بیٹھا اور اپنی چپل تلاش کرنے لگا۔ شاید سیب جو میں نے کل دوپہر کے کھانے میں سے بچا لیا تھا اب بھی طاق میں رکھا تھا۔ میں تفریح والے کمرے میں چلا گیا۔

گلیارے میں مزے دار خوشبو آ رہی تھی۔ میں نے لطف اندوز ہوتے ہوئے سونگھا اور کیبن کا دروازہ تھوڑا سا کھول دیا۔ آفیسرز کے باورچی خانہ میں کوئی نوڈلس تل رہا تھا۔ اچانک مجھے ایسا لگا جیسے مجھے اور نوڈلس نہیں چاہئیں! میں پنجوں کے بل چلتا ہوا واپس خواب گاہ میں چلا گیا ڈیڈی کی طرف مجرم کی طرح دیکھا۔ وہ آہستہ آہستہ خراٹے لے رہے تھے۔ اپنے پیچھے دروازہ بند کرتے ہوئے میں باورچی خانہ کی طرف تیزی سے چلا گیا۔

یہ اسپارکس، ریڈیو آفیسر تھا جو نہایت تیزی سے انڈوں اور نوڈلس کے مکسچر کو پھینٹ رہا تھا اور اُس کو سویا کی چٹنی میں تر کر رہا تھا۔

مجھے اسپارکس بہت اچھا لگتا تھا۔ وہ ہمیشہ ہر طرح کے کھیل کے لیے تیار رہتا تھا اور میں سہ پہر میں اکثر اُس کے کمرے کے ارد گرد منڈلاتا رہتا تھا۔ وہ لمبا اور پتلا تھا۔ نوڈلس جیسا، جھکی ہوئی مونچھوں اور باہر نکلے ہوئے کانوں والا۔

اُس نے بھنویں سکیڑیں جب میں داخل ہوا۔

"لو، وہ ایک اور چاند کو تکنے والا آ گیا۔ سونی، کیا تم میرے ساتھ آدھی رات کے کھانے میں شامل ہونا چاہو گے......؟"

"مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے"۔ میں نے خود کو بہت زیادہ پُر اشتیاق نہ ظاہر کرتے ہوئے کہا اور ایک بڑا سا ٹکڑا منہ میں ڈال لیا۔ "اوہو، تم تو بہت زبردست باورچی ہو، اسپارکس!" میں نے بھرے ہوئے منہ سے اظہارِ خیال کیا۔ تم چیف کوک کو ایک آدھ چیز سکھا سکتے ہو۔ میں نے کبھی ایسی مزے دار نوڈلس نہیں چکھیں......"

"عرشے پر جاکر کھانا چاہو گے ؟" اسپارکس نے رائے دی۔ ہم وہاں سے پورٹ سوئز کی روشنیاں اور اردگرد کے جہاز دیکھ سکیں گے"۔

ہم اپنے پیالے اور ے۔اپ کی دو بوتلیں لائف بوٹ کے عرشے پر لے گئے اور سیڑھی پر لٹکا دیا۔ یہ ایک اندھیری رات تھی لیکن عرشے کی بتیاں جل رہی تھیں۔ سمندر میں ہلکی سفیدی چمک رہی تھی ۔ طشتری نما بندرگاہ پہاڑیوں سے گھری ہوئی تھی۔ شہر کے میناروں کے دھندلے خاکے ، اور نئی بنی ہوئی فلک بوس عمارتیں اور ان سے اوپر اٹھی ہوئیں اُن کی روشنیاں دھیمی دھیمی جھلملا رہی تھیں۔

"کیا یہ خوب صورت نہیں ہیں؟" اپنی ڈرنک کی چسکی لیتے ہوئے اسپارکس بڑبڑایا۔ "خاص کر ہمارے آخری دو دن کے خراب راستے کے بعد"۔

میں نے گردن ہلائی۔ "وہ سب سیدھا اور ہلکورے لیتا ہوا۔ میں ابھی اس کا عادی نہیں ہو سکا ہوں۔ یہ ایسا ہے جیسے بھاگتے دوڑتے گھوڑے رہنا!

"اوہ، تم بہت جلدی اس کے عادی ہو جاؤ گے"۔

میں ایک طرف کو جھکا اور اپنی خالی بوتل پانی میں پھینک دی۔ یہ آہستہ آہستہ بہتی چلی گئی۔ مجھے ایک موٹی رسی پانی میں نیچے لٹکتی نظر آئی ۔ یہ نیچے عرشے کے کٹہرے کے ساتھ مضبوطی سے بندھی ہوئی تھی۔ اسپارکس نے بھی میری نگاہوں کا پیچھا کیا اور میرے ساتھ نیچے کی طرف جھکا۔

"عجیب بات ہے"۔ وہ تعجب سے بولا۔ "یہ میں نے اس سے پہلے یہاں کبھی نہیں دیکھی۔ یہ بوسن (عملے کا سردار) کا کام ہو سکتا ہے۔ کیا وہ آج جہاز پر رنگ کر رہا تھا؟"

"مجھے نہیں معلوم"۔

"بہر حال" اسپارکس اپنی گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا ، "اب واپس چلنا چاہیے ۔ کیپٹن بہت غصہ ہوگا اگر اس کو معلوم ہوا کہ تم خود سے اِدھر اُدھر گھوم رہے تھے"۔

"آؤ، اسپارکس، تم اُن سے نہ کہنا" میں نے درخواست کی۔

"شرط لگاؤ"۔ اُس نے میرا ہاتھ تھامتے ہوئے آنکھ دبائی اور اُس دروازہ کی طرف چلے جدھر سے آئے تھے۔
"آؤ چلیں!"

وہ جو بھی کچھ تھا!اچانک مجھے اپنی حس تیز ہوتی ہوئی محسوس ہوئی۔ " مجھے کچھ آواز آرہی ہے۔ اسپارکس،۔ایسی جیسے کہ کوئی ہتھوڑی مار رہا ہو۔

"اب،اب، سونی لڑکے! تم اب آدھی رات کو عرشے پر نہیں ٹہل رہے ہو۔کیا ایسا ہے؟ یقیناً، تمھارا مطلب یہ نہیں ہے کہ بوسٹن اس بے وقت اوور ٹائم کر رہا ہے۔اگرچہ اُس کو اگر ایسا موقع مل جائے۔وہ ایک حریص سالڑ کا ہے!

دھات کی دھیمی سی آواز کے بعد ایک لمبی چرمراہٹ کی آواز سنائی دی۔ میں نے چکراتے ہوئے اپنا سر ہلایا۔ میں کسی بارے میں سوچ بھی نہیں پارہا تھا۔ تمام لوگ سو رہے تھے، ہمارے اور ڈیوٹی آفیسر کے جو برج (جہاز پر سب سے اوپر والا کمرہ جہاں ملاح کام کرتے ہیں اور جہاں پر جہاز رانی کے آلات رکھے ہوئے ہیں) پر ہوگا اور لنگر پر نظر رکھے ہوگا۔

پھر اسپارکس کو کچھ سنائی دیا۔

"مضحکہ خیز"۔ اُس نے بے چینی سے تیوریاں چڑھائیں۔ "میں ادھر ادھر جاکر دیکھتا ہوں۔ اگرچہ ہو سکتا ہے کچھ بھی نہ ہو۔ تم، بہر حال اندر جاؤ اس سے پہلے کہ تمھارے ڈیڈی میری چمڑی اُدھیڑیں"۔

میں پیچھے رُک جانے والوں میں سے یقیناً نہیں تھا۔ کسی حال میں مجھے نیند نہیں آرہی تھی۔ اس لیے نیچے والے عرشے پر نیچے کی طرف اسپارکس کے پیچھے پیچھے گیا۔

نمک کے پانی کے چھڑکاؤ سے اُس جگہ پر پھسلن کا احساس ہو رہا تھا۔ میں نے اس کا ہاتھ سختی سے پکڑ لیا اور ہم نے جہاز کے پیچھے کی جگہ سے اپنا راستہ بنایا۔ یہ اسٹیل کے ڈبّوں کی اونچی اونچی قطاروں سے پُر تھا۔ یہاں اندھیرا تھا اور میرے پیر کے انگوٹھے میں کوئی نوکیلی دھات گھس گئی جس سے مجھے تکلیف ہوئی۔

"اُوچ!"۔ میں اپنے بڑے انگوٹھے کو سہلاتے ہوئے چیخا۔

"ہوشیاری سے، لڑکے ہوشیاری سے "اسپارکس نے متنبہ کیا۔ "ٹھیک ہے، مجھے یہاں کوئی بھی چیز نظر نہیں آتی"۔

جب ہم غیر یقینی کی حالت میں کھڑے تھے، بلا شبہ ویسی ہی ہتھوڑے کی آواز آئی۔اب یہ زیادہ قریب تھی۔ہاں، یہ ڈبّوں کی آخری دو قطاروں کے درمیان کے تنگ راستے میں سے آرہی ہے۔

اسپارکس جو عام طور پر متحمل مزاج تھا، صاف طور سے پریشان نظر آرہا تھا۔ وہ دھیان سے اندھیرے میں آگے کی طرف بڑھا جب کہ میں ہچکچایا ہوا وہیں کھڑا رہا۔

"خدا کی قسم! اُٹھائی گیرے!"، اپنے ٹوٹتے ہوئے سانس میں کہتے ہوئے اُس نے تیر پھینکا۔ "وہ ڈبّے کیوں کھول رہے ہیں" میں نے لمبے لمبے سانس لیے۔

"ہاں، وہ کسی طرح جہاز کی سائڈ پر چڑھ گئے ہوں گے۔ اگر میں غلط نہیں سمجھ رہا ہوں، اُن کے لیے ایک یا دو کشتی ساتھ ہی میں انتظار کر رہی ہوں گی۔

"سنو، اجے۔ تمھیں بہت تیزی سے حرکت کرنا ہے اس سے پہلے کہ وہ یہاں سے بھاگ جائیں۔ بھاگو اور اپنے ڈیڈی کو جگا دو۔ باقی کام وہ کرلیں گے۔ میرا خیال ہے ان ڈبّوں میں جاپان سے آیا ہوا قیمتی الیکٹرانک سامان بھرا ہے۔ میں یہاں انتظار کروں گا اور نظر رکھوں گا۔ اب جلدی جاؤ!"

میں نے بے قراری سے گردن ہلائی اور تیز بھاگا۔ تیزی سے تمام راستہ طے کیا۔ نیچے پائپ پر اور سیڑھیوں کے اوپر تیز تیز سانس لیتا ہوا ابھرا اوپر والے عرشے پر اپنے کیبن کی طرف لپکا۔

جب میں نے ڈیڈی کو جلدی سے جگایا اور اٹک اٹک کر ساری کہانی سنائی۔ وہ سمجھے میں ہوش میں نہیں ہوں۔

"تمھیں کیا پریشانی ہے بیٹا۔ تم خواب دیکھ رہے تھے! واپس جاؤ، خدا کے لیے سو جاؤ!"

ان کو یہ بات باور کرانے میں چند منٹ لگے کہ میں سنجیدہ ہوں۔ اور یہ کہ یہ کوئی خواب نہیں ہے۔

وہ ٹیلی فون کے لیے بیڈ سے اُچھل پڑے اور برج کو کرارے حکم دینا شروع کر دیے۔

" میری ڈیوٹی آفیسر سے بات کراؤ، جلدی ...... پورٹ کو فون کرو...... ایمرجنسی الارم بجاؤ...... عملہ کو باہر لے آؤ...... ڈیک کی بتیاں...... اور خدا کے لیے فاصلے پر رہو۔ وہ ہتھیار بند ہو سکتے ہیں"۔

کچھ ہی لمحوں میں میں نے انھیں اسپارکس کے پاس پہنچا دیا۔ جیسے ہی ہم قریب پہنچے انھوں نے سرگوشی میں کہا۔ "وہ تین ہٹے کٹے مقامی لوگ ہیں...... اُن کے پیچھے دو کشتیاں ہیں وہ اُن میں بھاری بنڈل پھینک رہے ہیں۔ اب وہ وہاں اُس ڈبّے میں ہیں......"

میں نے نیچے سمندر میں گھورا۔ جہاز کے سایہ میں پیچھے کی طرف چھوٹی چھوٹی دو کشتیاں چھپی ہوئی تھیں۔ ڈیڈی نے اپنا سانس روک لیا۔

اچانک ایک زور کی سیٹی کی آواز نے رات کے سناٹے کو چیر دیا۔ کشتیوں والے آدمیوں نے ہمیں دیکھ لیا تھا اور جہاز پر اپنے ساتھیوں کو ہوشیار کر رہے تھے۔

تین آدمی سایے میں سے ظاہر ہوئے۔ جیسے ہی انھوں نے جہاز کے آفیسر اور عملے کو دیکھا۔ انھوں نے بھاری سامان پھینک دیا اور کسی غیر ملکی زبان میں چیختے ہوئے لائف بوٹس کی طرف بے تحاشہ بھاگنا شروع کر دیا۔ نیچے والی کشتیاں بھی تیزی سے اسی سمت چل پڑیں۔

"رسّی جس کی مدد سے فرار ہو رہے تھے! اسے جلدی سے کاٹ ڈالو" میں نے چیف آفیسر سے چیخ کر کہا، جو کہ لائف بوٹس کے سب سے نزدیک تھا اور میں نے اُس موٹی رسّی کی طرف اشارہ کیا جو اِدھر اُدھر جُھول رہی تھی۔

بجلی کی سی پُھرتی سے اُس نے اپنی جیب میں رکھا چاقو نکالا اور رسّی کو کاٹ دیا۔ رسّی زمین پر زور سے گری۔

جب چوروں نے یہ دیکھا انھوں نے غصّے میں ایک دوسرے سے کچھ کہا اور انھوں نے جہاز کی طرف نشانہ باندھا۔

"ارے، نہیں، تم یہ مت کرو! میرے اچھے لوگو۔ تم کیا سوچتے ہو کہ تم کہاں جا رہے ہو؟" جیسے ہی اُن تینوں نے ریلنگ سے سمندر میں چھلانگ لگانے کی کوشش کی۔ بوسن کے بھاری ہاتھوں، بقر اور مضبوط جسم والے ملاحوں نے اُن کو دبوچ لیا۔

"یہ بہت آسان رہا۔ کھیل ختم ہو چکا ہے اور بدمعاشوں، تم سے کہا جاتا ہے کہ مزید کوئی چالاکی نہ کرنا......"

میں کھلکھلا پڑا۔ بوسن اور اس کا عملہ انھیں مرغیوں کی طرح مضبوط رسّی سے باندھ رہا تھا۔

سائرن کی آواز نے پولس بوٹ کے آنے کا اعلان کیا۔ عملے نے پُل کو نیچے کیا اور اپنے انسپکٹر کی رہنمائی میں پولیس کی ایک ٹیم جہاز پر آگئی۔

"کیپٹن! میں انسپکٹر شریف ہوں"۔ انھوں نے ڈیڈی سے ہاتھ ملایا۔ "آپ کا شکریہ جناب، کہ آپ نے ہمیں اطلاع دی۔" "پر بلائے جانے پر فوراً آگئے۔ یہ ہمارے لیے بہت قیمتی شکار ہے۔ یہ گروہ مہینوں سے بندرگاہ پر کام کر رہا تھا اور لنگر ڈالے ہوئے جہازوں کو لوٹ رہا تھا"۔ وہ اپنا سر سختی سے ہلاتا ہوا انھیں دیکھنے کے لیے مڑا۔

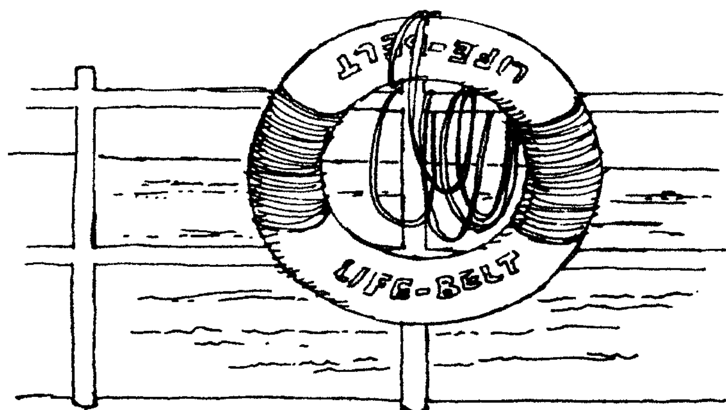


"ابھی تک یہ ٹھگ بہت چالاک تھے"۔ ہمیشہ ہمارے ہاتھوں سے بچ نکلتے تھے۔ عام طور پر اس سے پہلے کہ چوری کا پتہ لگتا، جہاز اگلی بندرگاہ کے لیے نہر سوئز کو پار کر چکا ہوتا اور ہمارے پاس اُن کو پکڑنے کے لیے کچھ نہ ہوتا۔ حتی کہ ایف۔ آئی۔ آر (پہلی اطلاع) بھی نہ ہوتی! ہم بس اتنا جانتے تھے کہ یہ گروہ نئے آنے والے جہازوں پر باز کی سی نگاہیں رکھتا تھا...... بہت اچھا ہوا، آج وہ اپنے برابر کی ٹکر سے ملے!۔ تو، جناب، آپ کی اجازت سے"۔ ان تینوں کے قریب جاتے ہوئے ہم اُن سے جو جھیں گے...... آپ کا شکریہ کیپٹن۔ آپ سب کا شکریہ۔ ہم آپ سے صبح ملیں گے اور اب آپ کو سونے دیں!"

ڈیڈی ایک بڑی مسکراہٹ کے ساتھ فخر سے میرے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے میری طرف مڑے۔

"میرا دل یہ سوچ کر دھڑکتا ہے کہ تم کس طرح وہاں عرشے پر رات کو ٹہل رہے تھے، بیٹے، لیکن۔۔ ٹھیک ہے لڑکو! حقیقت میں یہ بات خوشیاں منانے کی ہے۔ کل بینگو؟ عرشے پر دعوت ہے؟!"

میں نے خوشی سے سر ہلایا۔ میں اس سے زیادہ چاہ بھی نہیں سکتا تھا۔



دوستی کا ترانہ

"اوہ! کون ہے؟" تارا کسی سے ٹکرا کر چلائی۔ جلدی ہی اُس نے اپنا توازن درست کر لیا اور اندھیرے میں گھورنے لگی۔ دو بڑی بڑی آنکھیں اُسے گھور رہی تھیں۔

"تم کون ہو؟" وہ دوبارہ بولی۔

"وسنتھی" ایک نرم آواز نے کہا۔

"اوہ، میں شرمندہ ہوں۔ میں اپنا ٹینٹ تلاش کر رہی تھی"۔ تارا نے وضاحت کی۔

بجلی واپس آگئی اور فلوراسینٹ کی روشنی میں انھوں نے وسنتھی کو دیکھا جو ہرے رنگ کا سلک کا چھوٹا اسکرٹ اور ایک ڈھیلا ڈھالا بلاؤز پہنے ہوئے دُبلی پتلی لڑکی تھی۔ اُس کا رنگ سرخی مائل بادامی تھا، اچھا ناک نقشہ اور پُرکشش کالی آنکھیں تھیں۔ وسنتھی نے تارا کو دیکھا اور مسکرائی۔ تارا بھی جواباً مسکرائی۔

"او...... میں تو اپنا خیمہ تلاش کر رہی تھی"۔ تارا نے دوہرایا۔ بظاہر وسنتھی نہ سمجھ سکی کہ تارا کیا کہہ رہی تھی۔ وہ جلدی سے بولی،

"ین پروسنتھی" میرا نام وسنتھی ہے۔

تارا نے ایک خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ سر ہلایا۔ اُسے صرف لفظ 'وسنتھی' سمجھ میں آیا۔ دونوں کھل کھلا کر ہنس پڑیں اور اپنے اپنے گروپ میں شامل ہونے کے لیے الگ الگ راستوں پر چلی گئیں۔ وہ بین الریاستی اسکول کلچرل میلے میں حصہ لینے کے لیے آئی تھیں۔

تارا کا تعلق یو۔پی کے ایک چھوٹے سے شہر بلند شہر سے تھا، جس کی نمائندگی وہ ہلکی موسیقی

کے مقابلہ میں کر رہی تھی۔ ضلعی اور ریاستی سطح پر یہ مقابلے اُس نے آسانی سے جیت لیے تھے۔ اپنی عمر کے لحاظ سے تارا نہایت آسانی سے گا لیتی تھی۔ اُسے گانا گانا اسی طرح قدرتی طور پر آ گیا تھا جیسے کہ بچے کو چلنا آ جاتا ہے۔ اس عالیشان موقع پر مدراس تک کا دور دراز کا سفر اُس کے لیے ایک روح افزا تجربہ تھا۔ صرف ایک چیز جو اُسے اکھر رہی تھی وہ تھی اپنی کسی ہم عمر کا ساتھ نہ ہونا۔

اگلے روز تمام شرکا موسیقی کے ابتدائی اجلاس کے لیے جمع ہوئے۔ تارا کا ایک مرتبہ پھر وسنتھی سے سامنا ہو گیا جو اپنے گروپ کے ساتھ اسٹیج کے نزدیک کھڑی ہوئی تھی۔ وسنتھی نے خود اپنی طرف اشارہ کیا اور دانت نکالتے ہوئے بولی "ین پر و سنتھی"

"می، تارا"

"نی دہلی والا تم دہلی سے ہو؟" اُس نے پوچھا۔

"نہیں، بلند شہر سے، تم کہاں سے آئی ہو؟" تارا نے پوچھا

وسنتھی کچھ اٹ پٹائی اور جلدی سے بولی، "وارایور"۔ یہ اُس کے گاؤں کا نام تھا۔

تارا نے اُس کو دوہرانا چاہا لیکن اُس کی زبان حسبِ منشاء اُس کا ساتھ دے نہ سکی۔ تارا اپنے دانت باہر نکالتے ہوئے زور سے ہنسی۔ تارا نے دوبارہ پوچھا "کیا تم ہندی بول سکتی ہو؟"

"اِلے"، وسنتھی نے اپنے دونوں انگوٹھے اور اپنا سر ہلایا۔

"انگلش؟" تارا نے پوچھا اگرچہ وہ خود انگلش بولنے میں مہارت نہیں رکھتی تھی۔

"اِلے"، وسنتھی نے پھر اُسی انداز سے جواب دیا۔

ہر شریکِ مقابلہ نے اپنی ریاست کا ایک لوک گیت گایا۔ جب تارا نے اپنی پوری آواز سے مشرقی یو۔پی کا 'کجری' گایا تو ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔ کچھ دیر بعد وسنتھی کے تامل ناڈو کے لوک گیت 'کمی پٹو' نے سامعین کو بے خود کر دیا۔ وہ اونچی آواز میں گائے جا رہی تھی اور اُس نے ہال کو اپنے گانے میں ڈبو دیا تھا۔ ہر کوئی زبردست سراہ رہا تھا۔

میرا جو یو۔پی سے ایک دوسری شریک تھی اور کلاسیکی موسیقی میں ماہر تھی، کان میں بولی، "تارا، ہوشیار رہو تمہارا مقابلہ سخت ہے"۔

"ہاں، میرا بہن" تارا نے اقرار کیا۔ "وہ بہت اچھا گاتی ہے۔ لیکن میں سخت محنت کروں گی۔ ہم ضرور جیتیں گے"۔

"مجھے یقین ہے تم جیتو گی" میرا نے مکر ریقین دلاتے ہوئے اُس کے کندھے تھپتھپائے۔

اِدھر وسنتھی نے اس بات کا احساس کر لیا کہ اُس کی اصل حریف تارا ہے جس سے تھوڑی دیر پہلے ہی وہ سنجیدگی سے دوستی کرنا چاہتی تھی۔ آڈیٹوریم کے باہر تارا اپنے گروپ کے ساتھ کھڑی تھی۔ وسنتھی اُدھر آئی لیکن جیسے ہی اُن کی آنکھیں چار ہوئیں، تارا نے اپنا منہ دوسری طرف کر لیا اور وسنتھی بھی جلدی سے دوسری طرف چلی گئی۔ اب وہ ایک دوسرے کی ممکنہ حریف تھیں جو ایک ہی ایوارڈ کے لیے مقابلہ کر رہی تھیں۔

تمام دن تارا شو کے لیے تیاری کرتی رہی جب کہ وسنتھی بھی اپنے ٹینٹ کی تنہائی میں 'وینا' پر گھنٹوں ریاض کرتی رہی۔ وہ دونوں کھانے کے وقت ڈائننگ ہال میں ملیں۔ لیکن باقی وقت دونوں ایک دوسرے سے کتراتی رہیں۔

آخری بڑے شو سے پہلے تمام لوگ گھومنے کی غرض سے مہابلی پورم گئے۔ رو پہلی ریت، سمندر کا چمچماتا نیلا پانی، اور سہانی ٹھنڈی ہوا جادو جیسا اثر دکھا رہے تھے اور تارا اگلے دن کا مقابلہ بالکل بھول گئی۔ وہ مندر کے اِحاطہ کے دور کنارے کی طرف چلی گئی جہاں نرم نرم لہریں دیواروں سے لپٹ رہی تھیں۔ اُس نے میرا دی، اپنی استانی بہن جی اور دوسروں کو پیچھے چھوڑ دیا تھا۔ وہ مڑی اور اوپر کی طرف مندر کی شاندار عمارت کو نیلے آسمان کے مقابل دیکھنے لگی۔ مندر کی چوٹی کو دیکھتے ہوئے وہ آہستہ آہستہ پیچھے ہٹنے لگی۔ اچانک اُس کو ایک چیخ سنائی دی۔ تارا چلائی اور لڑکھڑائی۔ وہ کسی کی مضبوط گرفت میں آگری۔ دھاڑتی ہوئی لہروں نے اُس کے چہرے کا رنگ فق کر دیا۔ وہ کنارے کے بہت قریب تھی۔

"اوہ، بھگوان! میں تو گر ہی پڑتی اگر" اُس کو احساس ہوا جب اُس نے اوپر کی طرف نظر اُٹھائی۔

یہ وسنتھی تھی جو اُس کو اب تک پکڑے ہوئے تھی۔ تارا کے حواس درست ہوئے۔ وہ ہلکے سے مسکرائی "شکریہ" وہ آہستہ سے بولی۔

"اُونہہ ؟" وسنتھی نے ایک بھوں اوپر چڑھائی پھر زور سے اپنا سر ہلایا۔ "شکریہ" وہ خوشی سے جھوم اٹھی۔ تارا نے بھی اُسی انداز سے جواب دیا جب کہ میرا دی اور بہن جی بھاگی بھاگی وہاں پہنچیں۔

"بھگوان کا شکر ہے، اگر وسنتھی وہاں نہ بیٹھی ہوتی تو تم......"

میرادی کا سانس پھول رہا تھا...... بہن جی بیچ میں ہی بولیں، تمھیں دھیان سے رہنا چاہیے، تارا"...... بہن جی نے وسنتھی کے سر کو تھپتھپایا اور بولیں "تمھارا شکریہ"

وسنتھی کے گال سُرخ ہو گئے اور وہ اپنا ہاتھ ہلاتی ہوئی دور بھاگ گئی۔ "تمھارا شکریہ" وہ مڑی اور ایک فاصلہ پر جا کر چلائی اور زور سے ہنسی۔ اُس کی ہنسی میں مندر کی گھنٹیوں کی سی آواز تھی۔ اس بات نے تارا کے دل سے سارے حریفانہ احساسات مٹا دیے تھے۔ تارا ایک مرتبہ پھر اُس کے ساتھ دوستی کرنا چاہتی تھی۔ لیکن اپنی جان بچانے کے لیے وہ کس طرح وسنتھی کے احسان کا بدلہ چکا سکے گی۔

تارا اُس دن اکیلی اور چپ چپ رہی۔

"میں کل مقابلہ میں نہیں آؤں گی" اُس نے رازداری سے میرادی سے کہا۔

"بے وقوف مت بنو" میرادی کو دھکا لگا۔

"اگر نہیں گاؤں گی تو وسنتھی جیت جائے گی۔ آخر کو اُس نے میری جان بچائی ہے نا" تارا نے وکالت کی۔

"ہوں!" میرادی نے تارا کے چہرے پر جھانکتے ہوئے کہا "میں سمجھتی ہوں۔ یاد رکھو ایک حقیقی فن کار کبھی بھی خیرات لینا پسند نہیں کرے گا، چاہے وہ بہترین گلوکارہ کے خطاب کی شکل میں ہو"۔ انھوں نے وضاحت کی۔

تارا نے ایک لمحے کے لیے سوچا "ہاں آپ ٹھیک کہتی ہیں" اُس نے اس بات سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔

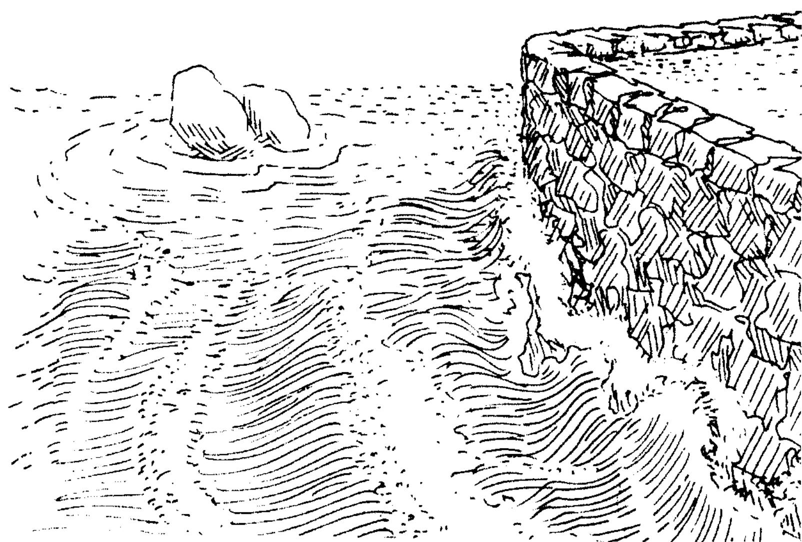
"لیکن...... تب میں کیا کروں!" تارا بس کی کھڑکی کے شیشے پر گھونسہ مارتے ہوئے بولی

"میں ہکلانے لگوں گی، میں بے سُرا گاؤں گی، میرادی" تارا مایوس ہو کر بولی۔

"نہیں، ہر کسی کو معلوم ہے کہ تم کتنا اچھا گاتی ہو" میرادی نے بحث کی۔

"تب......؟" تارا اچنبھے سے بولی۔ ایک منٹ بعد وہ جوش سے چلا اٹھی۔ پُر سکون ہوتے ہوئے اُس نے میرادی کے کان میں کچھ کہا۔





"دوبارہ سوچ لو۔ اُتاولی مت بنو۔ اس کا مطلب ہے نہ صرف اپنے، بلکہ اپنے اسکول کا وقار تج دینا ہوگا"۔

تارا کا عزم مصمم تھا۔ آخر کو وہ کسی اور کے نہیں بلکہ اپنی دوست کے مقابلہ سیکنڈر ہے گی"۔

آخر کار مقابلہ شروع ہوا۔ اُس نے میرادی کے چہرے پر نظر ڈالی اور تارا جان گئی کہ وہ چاہتی ہیں کہ تارا فرسٹ آئے۔

تارا نے 'راگ کلیان' میں ایک بھجن گایا۔ جب وہ اسٹیج سے نیچے اُتری تو میرادی نے اُسے چپٹا لیا۔ ایک ایک کر کے سب شرکا نے اپنے بہترین فن کا مظاہرہ کیا۔ ماحول میں ذہنی کھنچاؤ پیدا ہو گیا جب کہ سامعین نتیجے کا انتظار کر رہے تھے۔

وسنتھی اور تارا دونوں اعلیٰ ترین مقام کے لیے اٹک گئی تھیں۔

"ٹرافی ایک ہے اور اس کے لیے دونوں برابر کی اچھی مقابلہ باز ہیں۔ میں ان سے درخواست کروں گا کہ اب وہ ایک ایک گیت آخری فیصلہ کے لیے گائیں۔ اتر پردیش سے تارا تالیاں بجاتے ہوئے ججوں میں سے ایک جج نے اعلان کیا اور تارا کا اسٹیج پر استقبال کیا۔

"گڈ لک، تارا"، میرادی نے تارا کا ہاتھ زور سے دبایا۔

تارا اعتماد کے ساتھ اسٹیج پر چڑھی اور جب سامعین گرم جوشی سے اُس کا استقبال کر رہے تھے بالکل وہ پُر سکون تھی۔ مائک کے سامنے پہنچ کر تارا نے کنکھیوں سے وسنتھی کی طرف دیکھا۔ وسنتھی اُس کو دیکھ کر مسکرائی۔ اُس نے گڈ لک کہنے کے لیے اپنی بند ہتھیلیاں اوپر اُٹھا کر ہوا میں لہرائیں۔

تارا نے سر ہلا کر اُس کی بات کا جواب دیا۔ کچھ دیر کے لیے وہ خاموش رہی جس سے آڈیٹوریم میں سسپنس پیدا ہو گیا۔ تب تارا نے ایک نرم دلگداز تامل نغمہ گانا شروع کیا جو اُس نے اسکول میں سیکھا تھا......

"اودی ویلایدپاپا، نی اوندری کالا کا تھ پاپا......"

(بچے، تمھیں چست رہنا چاہیے، تمھیں سست نہیں ہونا چاہیے)

اُس نے اِس انداز سے گایا کہ دل کی دھڑکنیں تیز ہوتی گئیں جب تارا نے گانا ختم کیا تو حواس باختہ حیران سامعین نے زبردست تالیاں بجائیں۔

نیچے آتے ہوئے تارا وسنتھی کے پاس سے گزری۔ وسنتھی کی بڑی بڑی کالی آنکھوں میں تارا کے لیے بہت زیادہ محبت کی جھلک تھی۔

میرا دی تارا کی طرف لپکیں۔ اُن کے چہرے پر مایوسی کے آثار تھے۔ اُن کی مسکراہٹ چڑھی ہوئی تیوریوں میں بدل گئی تھی"۔ تم نے تامل گانا کیوں گایا؟ تمھیں معلوم ہے۔ تم اپنی مادری زبان میں بہتر گا سکتی ہو"۔ وہ غصہ میں آہستہ سے بولیں۔

"مجھے بہت اچھی طرح معلوم ہے"۔ تارا نے اپنی آنکھوں میں 'آپ کو معلوم ہے کیوں'، کی جھلک لاتے ہوئے جواب دیا۔ اُس نے جلدی سے سامعین میں اپنی جگہ لی، وسنتھی مائک پر تیار کھڑی تھی۔ اپنے ہاتھ سے ہلکا سا اشارہ کرتے ہوئے اُس نے اپنی سُریلی آواز میں زور سے اور صاف زبان میں ایک ہندی کا گانا گایا، جو اس نے اسکول میں سیکھا تھا......

"ہم ہوں گے کامیاب، ہم ہوں گے کامیاب ایک دن......" ایک مرتبہ پھر سامعین مدہوش سے ہو گئے۔ خاص طور سے تارا۔ اُس نے آہستہ آہستہ وسنتھی کے ساتھ ساتھ گانا شروع کر دیا۔ سامعین خوشی سے جھوم اُٹھے اور زوردار تالیاں گونجنے لگیں۔

کمپئیر ججوں کے پاس دوڑے۔ ایسا لگتا تھا وہ کسی فیصلے پر پہنچ گئے ہیں۔ آخر میں اُن میں سے ایک اسٹیج پر گیا اور اُس نے اعلان کیا۔ تارا اور وسنتھی"۔ دونوں آہستہ سے اُس تک گئیں اور اُس کے دائیں بائیں کھڑی ہو گئیں۔ اُس نے اُن کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لیا اور دونوں کو ایک ساتھ ہوا میں اوپر اُٹھا دیا۔ دونوں نے بہت اچھا گایا ہے اور دونوں۔ تارا اور وسنتھی کامیاب ہیں"۔

تارا اور وسنتھی ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے ہوئے ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرائیں۔ جب کہ تالیوں کی گونج میں کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔

دروازے میں کمپئیر کھڑا تھا جس کے ہاتھ میں ایک ٹرافی تھی جیسی کہ میز پر رکھی تھی۔

شریر گھڑی

"ارے، چھوٹے جن!" میرے والد کے دوست میری طرف اشارہ کرتے ہوئے بولے "یہ کرو...... لیکن یہ دھیان رکھنا۔ کسی دوسری چیز کو مت چھیڑنا" اُن کی زوردار آواز آئی۔

جو کچھ میں سمجھ سکا وہ 'یہ کرو' 'یہ نہ کرو' کی ایک طویل فہرست تھی جو میرے لیے جاری ہوئی تھی۔ آخر میں انھوں نے ایک پرانی بڑی گھڑی کی طرف اشارہ کیا اور کہا "اس کو تو چھونا بھی نہیں۔ سمجھے!" وہ دروازہ بند کرتے ہوئے باہر چلے گئے۔

مجھے ایک مثالی لڑکا بنانے کے لیے میرے والد نے مجھے اپنے دوست میرے انکل، گارجین جو نظم و ضبط کے سخت پابند تھے کی دیکھ بھال میں چھوڑ دیا تھا۔ فی الحال میں نے ایسا ہی کرنے کا ارادہ کرلیا جیسا کہ مجھے حکم ملا تھا۔ لیکن چھوٹی کالی چڑیا نے جو سفید ڈائل پر گھڑی کی دونوں سوئیوں کے درمیان بنی ہوئی تھی، میری توجہ دوبارہ اپنی طرف مبذول کرالی۔ تھوڑی دیر تک میں ادھر اُدھر ٹہل کر کسی دوسری چیز کو دیکھنے کی ناکام سعی کرتا رہا۔ لیکن اس بند کمرے میں، میں ایک چڑیا کی طرح بالکل آزاد تھا۔ میری آنکھیں پھر گھڑی کا جائزہ لینے لگیں۔

میرے سرپرست چچا کی یہ قدیم گھڑی مہینے میں بیس دن سے زیادہ خراب رہنے کے لیے بدنام تھی۔ باقی دنوں میں یہ شہر کے کسی نہ کسی گھڑی ساز کے شوکیس کی زینت بنی رہتی تھی۔ ایسا لگتا تھا گھڑی والی چڑیا مجھے دعوت دے رہی ہے۔ میں نے اپنا رُخ پھیر لیا اور دوسری چیزوں کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرنے لگا۔ حالاں کہ انھوں نے مجھے ایسا کرنے سے منع کردیا تھا۔

'لیکن تنہائی میں یہ میرے لیے بہترین موقع ہے۔' میں نے سوچا، اور اُن کی موٹی موٹی کتابوں میں سے ایک کھولی۔ میں نے اُس کو اپنی کورس کی کتابوں سے زیادہ بور پایا اور پھر بے زاری سے رکھ دیا۔

میری نظر ان کے سنہرے قلم پر پڑی۔

آہا! یہ ہے!' میں نے پین کو پکڑا اور چوم لیا۔ یہ دل کو موہ لینے والا قلم تھا۔ میں بڑی کرسی پر بیٹھ گیا اور اُن کے چکنے پیڈ پر کیرے مکوڑے بنانے لگا۔

میں اُلٹی سیدھی لائنیں اور دائرے کھینچتا رہا اور کاذوں کو ایک کے بعد ایک نیچے گراتا رہا۔ جلدی ہی فرش پر کاغذ کے پرزوں کا ایک ڈھیر لگ گیا۔ اچانک قلم نے لکھنا بند کر دیا۔!

میرے دل میں رحم دلی کے جذبات اُبھرے۔ ایک نیا آئیڈیا میرے دماغ میں کوندا۔ میں نے خود سے کہا' یہ پین کو بھرنے کا مناسب وقت ہے۔' پین کس طرح کام کرتا ہے۔ یہ بات میرے لیے ایک معمہ تھی۔ اس لیے میں نے پین کو بھرا اور پھر ٹلی کے ذریعے اُس کو خالی کر دیا اور ایسا کئی مرتبہ کیا۔ بے داغ سفید میز پوش گہرے نیلے دھبّوں سے چھینٹ دار بن گیا تھا۔ روشنائی کی دوات خالی ہو چکی تھی اور پین نیچے زمین پر گر گیا تھا۔ میں نے اُسے اٹھایا اور دیکھا کہ اُس کی نب مڑ گئی تھی۔ یہ دیکھ کر میں گھبرایا اور جلدی جلدی کام کیا۔ اپنے دانتوں کے بیچ پکڑ کر میں نے نب کی نوک کو دبایا۔ میری یہ کوشش کامیاب ہوئی۔ نب دوبارہ سے نوکدار ہو گئی تھی۔ مجھے دوسرا میز پوش نظر آگیا اور بقیہ لیٹر پیڈس سے میں نے روشنائی پونچھ دی۔ میں نے اس بات کو یقینی بنایا کہ پین ...... روشنائی کے ساتھ کی گئی میری کسی حرکت کا کوئی نشان نظر نہ آئے۔ میں نے یہ کام ختم کیا۔ میں نے محسوس کیا میں پھر آزاد ہوں۔

جیسے ہی میں نے اپنا سر گھمایا۔ میں نے دیکھا گھڑی کی چھوٹی کالی چڑیا مجھے دیکھ رہی ہے اور رُلا رہی ہے۔ لیکن کرارے چانٹوں کے خیال نے، جو میں اپنے پرانے تجربات پر اپنے گارجین کے ہاتھوں کھا چکا تھا۔ مجھے ایسا کرنے سے باز رکھا۔ اُن کے یہ الفاظ اس کو مت چھونا، میرے کانوں میں گونجنے لگے۔

اپنے خیالات کو وہاں سے ہٹانے کے لیے میں نے ایک کپ کافی بنانے کا ارادہ کیا۔ کافی بھی میرے لیے منع تھی۔ میں باورچی خانہ میں گیا اور کافی کا ایک کپ بنایا جیسے ہی میں نے پہلا گھونٹ بھرا، مجھے ایسا لگا جیسے شہد کی مکھی نے میری زبان کاٹ کھائی ہو۔ اس کا ذائقہ بہت تلخ تھا۔ اُس کی جلن کے سبب میں نے اُسے پینا چھوڑ دیا۔ میں نے چینی کے چند چمچ اُس میں گھولے اور جتنا دودھ موجود تھا سب کا سب اُس میں اُنڈیل دیا۔ ایسا کرنے سے یہ گاڑھی ہو گئی اور ایک پیسٹ بن گئی! بدقت تمام میں نے اُس کو پورا کیا۔



میں نے چین کا سانس لیا۔ چمکتی ہوئی گھڑی، اُس کے ڈائل پر بیٹھی ہوئی چڑیا نے میری توجہ پھر اپنی طرف کھینچی۔ اب میں خود کو زیادہ نہیں روک سکتا تھا۔

میں اُس کی طرف دبے قدموں سے گیا۔ دھڑکتے ہوئے دل اور کپکپاتے ہوئے ہاتھوں سے میں نے اُسے چھوا۔

آخر کار میں نے اُسے اُٹھا ہی لیا۔ دھڑکتے دل کے ساتھ میں نے اپنا تجربہ شروع کر دیا۔ سب سے پہلے میں نے اُس کی چابی کو اینٹھا۔ اور لو! دونوں سوئیوں نے ایک دوسرے کا پیچھا کرنا شروع کر دیا۔ ایک آہستہ چل رہی تھی جب کہ دوسری تیزی سے میرے اندر خوشی کی لہر دوڑ گئی۔

میں نے ایک دوسری چابی گھمائی۔ اب کی دفعہ تیسری چھوٹی سوئی نے جو چڑیا کے پاس تھی، تیزی سے چلنا شروع کر دیا۔ اچانک الارم نے زور زور سے 'ٹن ٹن' بجنا شروع کر دیا میں بے چینی سے اپنے پیروں پر اُچھل پڑا۔ کچھ دیر بعد میں نے الارم کو بجنے سے روکنا چاہا۔ اگر یہ بند نہیں ہوا تو مجھے یقین تھا، میں پکڑ لیا جاؤں گا۔ پسینے کے بوندیں میری بھنوں پر آ گئیں۔ میں بے چینی محسوس کرنے لگا...... کچھ دیر بعد الارم آہستہ ہو گیا اور رُک گیا۔ میں نے خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا۔

میں نے مزید کچھ وقت یوں ہی گنوا دیا۔ دوبارہ گھڑی کی طرف متوجہ ہوا۔ اِس مرتبہ میں نے ایک دوسری چابی گھمائی میں اُس کو گھماتا ہی رہا۔ یہاں تک کہ اُس نے مزید گھومنے سے انکار کر دیا۔ جلدی ہی مجھے "ٹک ٹِک' کی دل چسپ آواز سنائی دی۔ مشین نے ایک سُر میں ٹِک ٹِک جاری رکھی۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کروں؟ یہ ٹِک ٹِک یقیناً میرے خلاف گواہی دے گی...... اور مجھے اُس کو بند کرنا ہی چاہیے۔

اِس مرتبہ میں نے سوئیوں والی چابی کو اُلٹا گھمانا شروع کر دیا۔ میں انھیں گھماتا ہی رہا۔ چابی نکل کر میرے ہاتھ میں آ گئی! تب بھی گھڑی 'ٹِک ٹِک' کرتی ہی رہی!

میں نے چابی کو دوبارہ اُس سوراخ میں ڈالنے کی کوشش کی۔ لیکن یہ اُس میں فِٹ نہیں ہوئی۔ میں نے بہت کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہوا۔ 'ٹک ٹک' کی آواز آتی ہی رہی۔

میں نے خود کو برا بھلا کہا۔ میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور نا اُمیدی کے عالم میں دُعا کرنے لگا۔ میں نے عہد کیا کہ اگر یہ چابی اس سوراخ میں داخل ہو گئی تو پھر کبھی اُس کو دوبارہ نہیں چھیڑوں گا۔

ناامیدی کے عالم میں بھی اُمید رکھتے ہوئے میں نے آنکھیں کھولیں۔ افسوس! چابی اب بھی گھڑی کے برابر پڑی ہوئی تھی۔ ٹک ٹک، ٹک ٹک کا شور میرے کانوں پر ہتھوڑیاں بجا رہا تھا۔

میں مایوس ہو گیا تھا۔ لیکن تھوڑی دیر کے لیے۔ جلدی ہی ایک آئیڈیا میرے دماغ میں آیا۔ 'ہتھوڑے سے چابی کو سوراخ کے اندر پہنچادو!'

پیپر ویٹ آسانی سے ہاتھ آگیا۔ میں اُس کو ہتھوڑے کی طرح استعمال کر سکتا تھا۔ میں نے اُس کو اعتماد کے ساتھ اُٹھایا اور چابی پر آہستہ آہستہ مارا۔ 'ٹھک۔ ٹھک۔ ٹھک۔ ٹھک'

ایک معجزہ ہوا! چابی سوراخ میں فِٹ ہو گئی۔ لیکن مشین، 'ٹک، ٹک، ٹک، ٹک' ہی کرتی رہی۔

مجھے خوفناک قدموں کی چاپ سنائی دی۔ میرے دل نے دھڑکنا بند کر دیا۔ دروازہ زور سے کھلا اور میرے نگراں چچا اپنے مہمانوں کے ساتھ کمرے میں داخل ہوئے۔ میں اُن کے ساتھ مہمانوں کو دیکھ کر کتنا خوش ہوا تھا! کم از کم کچھ گھنٹوں کے لیے تو میں پٹائی سے بچ گیا تھا۔

اگلے روز میں نے اپنے نگراں چچا کو اپنے والد سے یہ کہتے ہوئے سنا۔ "تمھارا یہ جن ایک کمال کا لڑکا ہے۔ تمھیں پتہ ہے۔ شہر کے ہر گھڑی ساز نے اُس پرانی مشین کو ہاتھ لگانے سے منع کر دیا تھا۔ تم جانتے ہی ہو میں اُس کا کتنا دیوانہ ہوں۔ مجھے تعجب ہے اُس چھوٹے لڑکے نے اس کے ساتھ ایسا کیا کیا، کہ گھڑی بالکل ٹھیک چل رہی ہے بلکہ سیکنڈ تک کا وقت صحیح بتا رہی ہے۔"

یہ سب کیسے ہو گیا؟ کسی کو نہیں معلوم۔ لیکن اس بات نے میرا شیطان والا تاثر ختم کر دیا۔ اب یقین ہے کہ شیطان ہمیشہ بچوں کے پیچھے نہیں رہتا۔ کبھی کبھی یہ معصوم بچوں کی مدد بھی کرتا ہے...... جیسا کہ میں۔

'بینجی' کا کرسمس

کرسمس کا موقع تھا سڑکوں پر پرستان کا سا گماں ہوتا تھا۔ لال، نیلی، ہری اور پیلی بتیاں جو مارکیٹ میں چاروں طرف لگائی گئی تھیں، جگمگا رہی تھیں۔ کتنا پُر لطف سماں تھا! دکانوں پر بھی خوب روشنی کی گئی تھی۔ تین دکانوں پر کرسمس کے پیڑ بک رہے تھے۔ کتنے مختلف سائزوں کے تھے! اصلی بھی تھے اور کھلونا پیڑ بھی تھے۔ پیڑوں کو بہت خوب صورت انداز میں سجایا گیا تھا، جو سنہرے، روپہلے ربنوں، جھنڈیوں، چمکتے ہوئے رنگوں کے گولوں، سدا بہار اور امر بیلوں سے چھچھمار ہے تھے۔

بینجی دُکانوں کی کھڑکیوں میں سے ایک کھڑکی کے پاس کھڑا تھا اور ان میں سے ایک پیڑ کو نہایت اشتیاق سے دیکھ رہا تھا۔ کاش 'میں کسی طرح ایک پیڑ لے سکتا! سمّی اور رُتھ کتنی خوش ہوں گی۔ اُن کے لیے یہ ایک بھرپور کرسمس ہوگا۔

اُس کو وہ درخت پھر یاد آیا جو اُس نے اُن تین دکانوں میں سب سے بڑی دکان پر دیکھا تھا۔ میں اُس کو ہی خریدوں گا، جیسے ہی اُس نے یہ فیصلہ کیا وہ دکان میں اندر داخل ہو گیا

"صاحب،! اِس کی کیا قیمت ہے؟" اُس پیڑ کی طرف اُمید بھرا اشارہ کرتے ہوئے مالک سے پوچھا۔ موٹے، گنجے دکاندار نے جس کا نام اَبراھم تھا۔ بینجی کو اوپر سے نیچے تک دیکھا۔ اُس کی نگاہیں بینجی کی قمیض میں اوپر دائیں طرف بنے ایک بڑے سوراخ کی طرف تھیں۔ بینجی نے اپنا ہاتھ بیچ میں ہی روک لیا جیسے ہی خود بخود اُس سوراخ کو ڈھکنے کے لیے اُٹھا ہو۔ آخر کار،

اُس نے سوچا۔ میرے پاس جیب میں پورے اٹھائیس روپے ہیں۔ کیا ہوا اگر میری قمیض میں سوراخ ہے۔'

لیکن دکان دار کے الفاظ نے اُس کا اعتماد توڑ دیا۔ "یہ پینتیس روپے کا ہے"۔ کیا تم اسے خریدنا چاہتے ہو؟" ننجی کا چہرہ اُتر گیا۔ جب اُسے پتہ چلا کہ اس پیڑ کو، جو اُسے بہت پسند تھا، خریدنا اس کے بس میں نہیں ہے۔ اٹھائیس روپے کم نہیں ہوتے! یہ اس کی سخت محنت کی کمائی تھی جو اس نے سات دن تک نیچے سڑک پر بنے ڈھابے پر کام کر کے حاصل کیے تھے۔ گھنٹوں اس نے گاہکوں کی خدمت کی تھی اور ان گنت کھانے کی پلیٹیں، لڑکھڑاتی ہوئی لکڑی کی میز سے اِدھر سے اُدھر لے گیا تھا۔

اب وہ اپنی چھوٹی بہنوں 'سمّی اور 'رُتھ' کے لیے کرسمس کا ایک پیڑ خریدنا چاہتا تھا۔ اُس کا خیال تھا کہ پیڑ پچیس روپوں کا ہوگا۔ بچے ہوئے پیسوں سے وہ سجاوٹ کی دوسری چیزیں خرید لے گا۔

"لیکن...... لیکن صاحب" وہ جھجکتا ہوا بولا "مجھے یاد ہے پچھلے سال ٹھیک اسی طرح کا پیڑ پچیس روپے کا تھا"۔

"دیکھو لڑکے وہ پچھلے سال کے دام تھے۔ اب قیمتیں چڑھ گئی ہیں۔ میری دکان میں کوئی بھی پیڑ پچیس روپے سے کم کا نہیں ہے۔ تمھیں خریدنا ہے یا نہیں؟" اُس نے اپنی لمبی چوڑی چھاتی پھلائی اور ننجی کو گھورا۔

ننجی کا چہرہ سراسیمگی سے سُرخ ہو گیا۔ 'کتنا گندا آدمی ہے!' اُس نے سوچا اور دکان سے مایوسی کے عالم میں باہر آگیا۔ وہ دروازے کے قریب رکھی ہوئی ریت کی بالٹی سے ٹھوکر کھاتے کھاتے بچا۔ "یقیناً' میرا خیال ہے جب کہ لوگ اس کے سارے پیڑ خرید رہے ہیں اُس کو میری پرواہ نہیں ہونا چاہیے تھی۔' دکان میں بہت بھیڑ تھی۔ بچے اور والدین آپس میں ایک دوسرے سے چلا چلا کر باتیں کر رہے تھے کہ کون پیڑ سب سے زیادہ اُن کی پسند کا ہے۔

'اوہ' میں مزید سات روپے کہاں سے لاؤں؟ ننجی نے سوچا۔ وہ اس خیال سے خوف زدہ ہو گیا

کہ اُس کے گھر میں کرسمس کا کوئی پیڑ نہیں ہوگا۔ ممی اور رُتھ اس کی واپسی کا بے چینی سے انتظار کر رہی ہوں گی تاکہ وہ اُسے خوب صورت چیزوں سے سجا سکیں جیسا کہ اُس نے یقین کے ساتھ اُن سے وعدہ کیا تھا۔ اُس نے آج رات اپنے دوستوں کو بھی گھر پر مدعو کیا تھا تاکہ وہ بھی اُس کے ساتھ کھانے اور تفریح میں شریک ہو سکیں۔ اوہ! بغیر پیڑ کے اُن کا سامنا کرنا کتنا تکلیف دہ ہوگا جب کہ وہ اُس کے بارے میں بہت زیادہ باتیں کر چکا تھا!

بینجی کا گھر شہر کے دوسرے کنارے پر بنی دو کمروں والی ایک چھوٹی سی جھونپڑی تھی۔ یہ جگہ مارکیٹ سے بہت مختلف تھی جس میں طرح طرح کی دکانیں تھیں۔ اپنی جیبوں میں ہاتھ ڈالے، اپنے پھٹے ہوئے جوتوں کی نوک سے کنکریوں کو مارتا ہوا بینجی یوں ہی ادھر ادھر گھومتا رہا۔ مارکیٹ کے ایک سرے پر ایک ادھ بنی عمارت کھڑی تھی۔ چوں کہ اس وقت شام ہو چلی تھی اس لیے وہ جگہ بھی سنسان ہو گئی تھی۔ تھوڑی دیر کے لیے بینجی وہاں ایک ریت کے ڈھیر پر بیٹھ گیا۔ وہ سردی میں ہلکا ہلکا سکڑ رہا تھا۔ پھر وہ دکانوں پر واپس گیا۔ شاید انھوں نے پہلی مرتبہ غلطی سے مجھے غلط قیمت بتادی ہو۔'

لیکن نہیں! اس میں کوئی غلطی نہیں تھی۔ حتّٰی کہ سب سے چھوٹا پیڑ بھی پینتیس روپے کا تھا۔ 'صرف سات روپے کم رہ گئے تھے"! اوہ 'میں نے یہ زائد رقم بھی پچھلے ہفتوں میں کیوں نہیں کما لیے ؟ میں چند روز اور ڈھابے میں کام کر کے با آسانی حاصل کر سکتا تھا۔' وہ مایوسی میں تقریباً سوویں مرتبہ چلایا۔

کچھ دیر ادھر ادھر گھومنے کے بعد اس نے خود کو مسٹر ابراہم کی دکان کے سامنے کھڑا پایا۔ روشنی سے چمچماتی کھڑکی سے اُس نے دیکھا وہ پیڑ وہاں اب بھی موجود تھا جس کے لیے اُس نے ذہن بنالیا تھا۔

یکایک اُس نے دیکھا مسٹر اَبراھم خوشی سے اپنے ہاتھ ملتے ہوئے دکان سے باہر آ رہے تھے۔ وہ خود ہی خود بہت خوش نظر آ رہے تھے۔ وہ دکان کے باہر کھڑا ادھر سے اُدھر آنے جانے والے لوگوں کو دیکھتا رہا۔ جب بینجی دیکھ رہا تھا تبھی دکان پر لگا بڑا سا نیون سائن والا بورڈ جو لال


HAPPY

اور ہری پتیوں سے جل رہا تھا بُجھ رہا تھا اور جس پر 'کرسمس کے درخت برائے فروخت' لکھا تھا، نیچے کی طرف گرنے لگا۔

بینجی نے سڑک کے اُس پار چھلانگ لگائی اور مسٹر ابراھم کو اتنی زور سے پیچھے کی طرف دھکا دیا کہ وہ دونوں زمین پر آ پڑے۔ اُسی لمحے سائن بورڈ زور سے گرا اور ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔

"کیا ہے...... کیا؟" دکان دار چکرا گیا۔

"اوہ" بینجی چلایا "تاروں سے چنگاریاں نکل رہی ہیں"۔

جیسے ہی وہ اوپر اُچھلا، تار وہاں پڑے ہوئے گتے کے ایک ڈبے کو چھو گیا اور فوراً ہی آگ لگ گئی۔ "اوہ' اوہ، آگ! مدد! آگ! مسٹر ابراھم جو ابھی تک زمین پر بیٹھے ہوئے تھے، خوف سے چلائے۔

لفظ "آگ" نے جادو کا سا کام کیا۔ چند ہی سیکنڈوں میں ایک بڑی بھیڑ جمع ہو گئی۔ بینجی دکان میں اندر کی طرف بھاگا۔ اُسے دکان میں رکھی ریت کی وہ بالٹی یاد آ گئی جس سے وہ تقریباً ٹکرا ہی گیا تھا جب وہ پچھلی مرتبہ وہاں گیا تھا۔ وہ باہر کی طرف بھاگا اور اُسے جلتے ہوئے گتے کے ڈبے پر اُلٹ دیا۔ اب تک چند دوسرے لوگ بھی ریت کی بالٹیاں لیے ہوئے اُس طرف دوڑ رہے تھے، جب کہ بہت سے دوسرے چلا رہے تھے "آگ بجھانے والی گاڑی کو بلاؤ، جلدی کرو! جلدی کرو! آگ لگ گئی ہے"۔

کافی دیر کی افراتفری کے بعد خطرہ ٹل گیا اور تماش بین جوش میں باتیں کرتے ہوئے آہستہ آہستہ وہاں سے چلے گئے "اُس بہادر لڑکے نے مسٹر ابراھم کو بچایا ہے۔ اوہ، کتنا بہادر لڑکا ہے!"

مسٹر ابراھم بینجی کی طرف مڑے۔ انھوں نے بینجی کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "اوہ، تمھارا شکریہ، تمھارا بہت بہت شکریہ۔ تم نے شاید میری جان بچائی ہے"۔ انھوں نے اظہار کیا۔ اُن کی آواز جذبات سے بھر گئی تھی۔

"کوئی بات نہیں جناب، مجھے خوشی ہے کہ آپ صحیح سلامت ہیں"۔ بینجی نیچے اپنے پیڑوں کی

طرف دیکھتے ہوئے مضطرب ہوتے ہوئے بولا۔ "مجھے گھر چلنا چاہیے"۔ وہ بدبدایا اور مڑ ہی رہا تھا کہ مسٹر ابراھم آرام سے بولے، "مجھے تم یاد ہو۔ تم چند گھنٹے پہلے یہاں آئے تھے۔ یہی وہ پیڑ ہے جو تم چاہتے تھے، ہے نا؟" انھوں نے اُسی پیڑ کی طرف اشارہ کیا جس کو خریدنے کے لیے بینجی بے چین تھا۔

بینجی خاموش رہا۔ "میں یہ پیڑ تمھیں تحفے میں دینا چاہوں گا، مہربانی کر کے اسے قبول کر لو"۔ مسٹر ابراھم نے کہا۔ "اس سے مجھے بہت خوشی ملے گی"۔ بینجی کو یقین نہیں آیا اُس نے اپنے چٹکی لی کہ کہیں وہ خواب تو نہیں دیکھ رہا ہے۔ اُس کی آنکھوں میں خوشی کی چمک دوڑ گئی۔

"اوہ، شکریہ جناب، لیکن آپ یہ پیسے رکھ لیں باقی میں چند دنوں میں ادا کر دوں گا"۔

"نہیں۔ نہیں" مسٹر ابراھم نے احتجاج کیا۔ "مہربانی سے پیسوں کا ذکر کر کے میری بے عزتی مت کرو۔ میں یہ تمھیں تحفے میں دینا چاہتا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ تم نے جو میری جان بچائی ہے یہ اُس کے بدلے میں کچھ نہیں ہے، لیکن کیوں کہ تمھیں یہ پسند تھا اس لیے میں نے سوچا کہ ...... "اور وہ چپ ہو گیا۔ وہ کچھ پریشان لگ رہا تھا۔

بینجی نے جواب دیا "اوہ! شکریہ جناب، آپ کی بہت بڑی مہربانی ہے۔ میری چھوٹی بہنیں کتنی خوش ہوں گی آپ کو معلوم ہے۔ میں نے آج رات کرسمس پیڑ کے ساتھ گھر آنے کا وعدہ کیا تھا"۔

"تب یقیناً، تمھیں اُن کو مایوس نہیں کرنا چاہیے لڑکے! مسٹر ابراھم نے زور کی مسکراہٹ کے ساتھ کہا "ایک منٹ یہاں انتظار کرو" اور وہ دکان کے پیچھے والے چھوٹے کمرے میں چلا گیا۔ ایک لمحے بعد وہ گتے کے ایک بڑے ڈبے کے ساتھ لوٹا۔ "اس کو پیڑ کے ساتھ لیتے جاؤ پلیز، اس میں اسے سجانے کے لیے کچھ چیزیں ہیں اور اب میری سپلائی والی گاڑی تمھیں تمھارے گھر تک چھوڑ آئے گی، نہیں تو تمھارے لیے اسے ہاتھوں میں لے جانا ایک مسئلہ ہو گا"۔

جب بینجی گھر پہنچا تو جو گلی چند گھنٹوں پہلے سرد اور سنسان لگ رہی تھی اب گرم اور خوش نظر آ رہی تھی لال اور ہری بتیوں میں سے نکلنے والی گرم سرخی اس کے دل کی گرمی کو چھو رہی تھی۔ کرسمس کا پیڑ گاڑی سے اتارنے کے بعد بینجی نے ڈلیوری مین سے ایک لمحہ انتظار کرنے کو کہا۔ "میں کچھ چیزیں مسٹر ابراھم کو بھیجنا چاہتا ہوں"۔ اپنے گھر میں اندر گھستے ہوئے بینجی

نے پین اور پینسل کے لیے چاروں طرف دیکھا۔ اُس نے سوچتے ہوئے پینسل کا سِرا چبایا اور ایک تحریر لکھی۔ باہر آکر اُس نے ایک بند لفافہ اُس آدمی کو دیا اور کہا کہ یہ مسٹر ابراھم کو دے دے۔ اُس نے اطمینان کا سانس لیا!

اُس رات جب امرا اور راہل نہ چاہتے ہوئے بھی وہاں سے چلے گئے اور دونوں لڑکیاں شام کے جوش و خروش کے بعد سو گئیں تو کرسمس کے پیڑ کو، جو پورے کمرے کو منور کر رہا تھا، دیکھنے بیٹھ گیا۔ اتنی ساری سجاوٹ کی چیزیں! سدا بہار، امر بیل، خوش رنگ اسٹیمرز، سنہرے اور روپہلے شیشے کے گولے، اور لال، ہری اور پیلی بتیاں۔ لیکن جو ان لوگوں کو سب سے زیادہ اچھا لگا وہ تھا سنہرا ستارہ، جو انھیں گتّے کے اُس ڈبے میں ملا تھا۔ بینجی نے اُسے پیڑ کی چوٹی پر رکھ دیا تھا۔ جب اُس نے اُسے اندھیرے میں جھلملاتے دیکھا تو ایسا لگا جیسے کہہ رہا ہو، ''میں یہاں رکھا ہونے سے خوش ہوں''۔

جب مسٹر ابراھم نے لفافہ کھولا اُس میں اُسے کچھ روپے ملے اور ایک تحریر ''جناب ان پچیس روپوں کو قبول کرلیں۔ یہ پچھلے سال پیڑ کی قیمت تھی۔ میں نے زیادہ کام نہیں کیا۔ میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ سیزن کی مبارک باد کے ساتھ '' بینجی''۔



اَن کے مَن کے ٹمپیٹو

اس سال میری سال گرہ زبردست ہو گی"۔ میں نے مزاحیہ انداز میں کہا۔" مجھے جوتوں کا ایک جوڑا اور ہاتھ کی بنی ہوئی ایک جرسی ملیں گے۔ میں نے ٹیبل ٹینس کے سیٹ کی فرمائش کی تھی، لیکن میری ماں نے کہا تھا 'اس سال اور کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔'

میرے دوست مَنک نے مجھے غور سے دیکھا۔ وہ میرے اور قریب ہو گیا اور بولا" ٹھیک ہے روبن! میں یہ نہیں کہتا کہ مجھے اس پر یقین ہے، لیکن میرے چچازاد بھائی کا کہنا ہے کہ یہ کام کرے گا اور کوشش کر کے دیکھ لینے میں کوئی حرج بھی نہیں ہے۔ کیا تم ایسا نہیں سوچتے؟"

"کیا کر کے دیکھ لیں؟" میں نے سوال کیا۔

"ہاں" میرے چچیرے بھائی نے کہا تھا،"اگر تمھیں کسی چیز کی سخت طلب ہے تو تمھیں آدھی رات کو پیپل کے درخت کے چاروں طرف چکر لگانا ہو گا اور سترہ بار 'اَن کے مَن کے ٹمپیٹو' کا وِرد کرنا ہو گا۔"

میں اپنی خواہش کو پوری کرانے کے لیے بے چین تھا۔ پھر بھی میں نے پوچھا" سترہ بار ہی کیوں؟ اور آدھی رات کے وقت کیوں؟"

"مجھ سے سوالات مت کرو،" مَنک نے جو میرا بہترین دوست تھا جواب دیا" میں سمجھتا ہوں اس کو اسی طرح کیا جاتا ہے۔ اُس کو آزما کر کیوں نہ دیکھ لیں۔" یہ کچھ نقصان تو پہنچائے گا نہیں۔"

میں نے سوچا، یہ سب بکواس ہے۔ اس کے علاوہ ہمارے پڑوس میں کوئی پیپل کا پیڑ بھی نہیں تھا۔ ایک درخت بوڑھی، مسز گرودور کے باغ میں ضرور تھا۔ لیکن اُن کے باغ میں داخل ہونے کی ہمت کس میں تھی؟ کم از کم میری تو ہمت تھی نہیں! وہ بھی آدھی رات کے وقت!



پچھلے سال تک مسز گرو ور ہمارے اسکول کی پرنسپل تھیں۔ اُن کی چبھتی ہوئی ہلکی سبز آنکھوں کی ایک نگاہ بڑے بڑے سورماؤں جیسا کہ دسویں کلاس کا رنکولال کو خاموش کرنے کے لیے کافی تھی۔ میں نے ایسا واقعہ اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔

"اسے بھول جاؤ" میں بولا۔ لیکن یہ خیال سالگرہ کے ایک روز پہلے تک مجھے برابر پریشان کرتا رہا اور میں اس کے علاوہ کوئی دوسری بات سوچ بھی نہیں پار ہا تھا۔

"ٹھیک ہے" میں نے منک سے کہا "اگر تم میرے ساتھ چلو تو میں آج رات مسز گرو ور کے باغ میں جاؤں گا اور اس ٹوٹکے کو کروں گا"۔

"میں تمھارے ساتھ کیوں جاؤں؟ میری تو کوئی ایسی خواہش نہیں ہے جسے پورا کرانا ہو"

"آؤ چلیں" میرے ٹیبل ٹینس سیٹ کے لیے دُعا کریں"۔

میں اور منک رات کو جب بارہ بجنے میں دس منٹ باقی تھے بوڑھی مسز گرو ور کے باغ کے پچھواڑے ملے۔ ہم اوپر چڑھ گئے اور چار دیواری پر بیٹھ گئے۔ ہم نے نیچے باغ میں دیکھا جہاں اندھیرا تھا اور چاند کی مدھم روشنی میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ وہاں پیپل کا ایک درخت تھا! اُس کی شاخیں رات کی ہلکی ہوا میں جھول رہی تھیں۔ ہم نیچے کودے، پیڑ کے پاس پہنچے اور دھیان سے چاروں طرف دیکھا۔

"سوچو، اگر وہ جاگ رہی ہوئیں! میں نے سرگوشی میں کہا اور مسز گرو ور کے مکان کی طرف اشارہ کیا۔

"رات کے اس بھیانک وقت میں کوئی نہیں جاگتا، منک بہت آہستہ سے بولا "آؤ، اب اپنا کام کریں۔ دوڑو!"

میں دوڑا اور اتنی تیز دوڑا جتنا تیز دوڑ سکتا تھا اور "اَن کے مَن کے ٹمپٹو" میں دُعا کرتا ہوں کہ میری خواہش پوری ہو"۔ کو بار بار دُہراتا رہا۔ میں کچھ گھبراہٹ محسوس کرنے لگا تھا۔ اس لیے میں نے اسے جلدی پورا کرنا چاہا اور اپنی رفتار بڑھا دی۔ میں نے منتر بھی جلدی جلدی پڑھنا شروع کر دیا! اور اسی بیچ میں رات کی آوازیں بھی سنتا رہا۔ کبھی یہاں سے چرچراہٹ کی آواز آتی تو کبھی ادھر سے سنسناہٹ سنائی دیتی۔

اچانک بھونکنے کی ایک خونخوار آواز نے رات کی خاموشی کو توڑ دیا! میں جم گیا۔ مسز گرو ور کے گھر کے اندر بتیاں جل اٹھیں اور پچھلا دروازہ کھلا۔

"کون ہے؟" مسز گرووَر نے پوچھا۔ "جواب دو، ورنہ میں تمھارے اوپر کتا چھوڑ دوں گی"۔

"مَنک، مَنک" میں گھگیایا "کچھ کہو"۔ لیکن مَنک تو پیڑ کے اوپر چڑھ رہا تھا۔ جب میں نے مسز گرووَر کو نیچے جھک کر کتے کو کھولتے ہوئے دیکھا۔ تب میں نے التجا کی "برائے مہربانی ہم پر کتا مت چھوڑیے۔ اگر آپ موقع دیں تو میں سب باتیں آپ کو بتادوں گا"۔

"جلدی کہو" مسز گرووَر چیخیں۔

میں نے اُنھیں تمام بات بتادی۔ مجھے ڈر تھا کہ وہ میری بات کا یقین نہیں کریں گی۔ لیکن انھوں نے بغیر دخل دیے میری پوری بات سُنی۔ انھوں نے صرف مجھے اپنی سخت، ہلکی سبز آنکھوں سے دیکھا جیسے کہ وہ میرے دل کو ٹٹولنا چاہ رہی ہوں۔

"پھر؟" انھوں نے آخر میں سوال کیا "اور تمھیں اَن کے مَن تمپچو میں یقین ہے؟ تمھارا خیال ہے یہ تمھاری مدد کرے گا؟"

میں نے اپنا سر جھکالیا اور آہستہ سے بولا "مجھے امید ہے یہ کرے گا!"

"ٹھیک ہے" وہ واپس لوٹ گئیں۔ "اگر تمھیں ایسا یقین ہے تو جاؤ اپنے چکر پورے کرلو"۔ یہ کہتے ہوئے مڑیں، "اور واپس جاتے وقت سامنے والا دروازہ استعمال کرنا"۔

میں نے بقیہ چھ چکر پورے کیے اور سامنے والے دروازے سے باغ سے باہر آگیا۔ میں نے قسم کھائی کہ اب کبھی دوبارہ نہیں لوٹوں گا۔

اور پھر وہ اہم گھڑی آگئی۔ میں نے اپنے تحفے کھولے۔ اپنے جوتوں کے نئے جوڑے کو اور ہاتھ کی بُنی ہوئی جرسی کو دیکھ کر خوش ہو رہا تھا! اور تبھی میری نظر ایک پارسل پر پڑی۔ یہ ایک بڑا پارسل تھا!

مجھے اتنا بڑا پارسل پہلے کبھی نہیں ملا تھا۔

"روہن کھنہ کو" میں نے پڑھا "ان کے من کے ٹمپچو کی طرف سے!"

میں نے مَنک کو گھورا اور وہ بھی اتنا ہی حیرت زدہ لگ رہا تھا جتنا کہ میں"۔ میری ماں نے پوچھا "یہ ان کے من کے ٹمپچو کون ہے؟ کیا یہ ایک غیر معمولی نام نہیں ہے؟"

"ہاں" میں بولا "یقیناً بہت غیر معمولی"۔

میں پارسل پر جھکا اور اُسے کھولنے لگا۔ میں نے دھاگا اور کاغذ بے صبری سے اُتارا۔ آخر میں

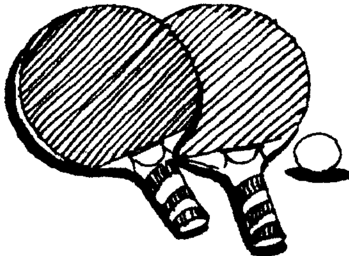
میں نے رنگین تحفہ والی پیکنگ کو اُتارا اور ایک ٹیبل ٹینس سیٹ پایا، یہ بالکل نیا ٹیبل ٹینس سیٹ نہیں تھا، بلکہ یہ جھوٹ موٹ کا تھا۔ ''اوہ'' میں پھسپھسایا ''اوہ!''

ٹنک آج بھی قسم کھا کر کہتا ہے کہ اُس کا اس (تحفہ بھیجنے) سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ میرے والدین بھی ایسا ہی کہتے ہیں۔ مجھے تعجب تھا کہ آیا مسز گرو ور اس اچنبھے کے لیے ذمے دار تھیں۔ بہت عرصہ تک میں تعجب میں رہا۔ ایک دن میں نے اپنی ساری قوت جو کچھ کہ میں رکھتا تھا اکٹھا کی اور مسز گرو ور سے ملنے گیا۔ میں نے سامنے والا دروازہ استعمال کیا اور گھنٹی بجائی۔ میں نے اپنی بات کو دل ہی دل میں سینکڑوں مرتبہ دوہرایا یعنی جیسے ہی انھوں نے مجھے اپنی ہلکی سبز آنکھوں سے دیکھا، مجھے اپنا دل ڈوبتا ہوا محسوس ہوا اور میری ہمت جواب دے گئی اور جو کچھ میں بے وقوفوں کی طرح کہہ سکا وہ یہ تھا ''گڈ ایوننگ، میڈم۔ کیا آپ نے، میرا مطلب ہے...... کیا آپ نے؟...... کیا آپ نے...... معاف کیجیے...... لیکن...... کیا آپ یقین رکھتی ہیں...... ان کے من کے ٹمپٹو میں؟''

مسز گرو ور مجھے تعجب خیز نگاہوں سے دیکھتی رہیں۔ انھوں نے نرمی، لیکن سنجیدگی سے جواب دیا ''ہاں' میں اَن کے مَن کے ٹمپٹو' میں یقین رکھتی ہوں۔ میں نے چاہا تھا کہ آج شام کوئی چائے پر میرے ساتھ ہو۔ اور تم آگئے! کیا یہ ان کے من کے ٹمپٹو کی کھلی نشانی نہیں ہے؟''

وہ مسکرائیں اور وہ آج بہت مختلف نظر آرہی تھیں۔ بالکل انسان!

اُس دن کے بعد سے اکثر میں ٹنک مسز گرو ور سے ملنے چلے جاتے تھے۔ صرف اس لیے نہیں کہ وہ بہترین چائے اور بہترین کھانے کی چیزیں بناتی تھیں، نہیں! ہم ان کے پاس اس لیے جاتے تھے کیوں کہ ہم انھیں پسند کرتے تھے اور پھر ہم میں ایک چیز مشترک تھی۔ ہم سب ان کے 'من کے 'ٹمپٹو میں یقین رکھتے تھے!



فتح

سکندرِ اعظم نے بہت سی لڑائیاں جیتی تھیں۔ اُس کی خواہش ساری دنیا کو فتح کرنے کی تھی۔

"سونے کی چڑیا" کی طرف بڑھو" اُس نے اپنے بہادر جرنیلوں کو حکم دیا۔

ہندوستان اُس زمانہ میں سونے کی چڑیا کے طور پر مشہور تھا۔ سکندر کے حکم پر اُس کے جرنیلوں نے نقشہ دیکھا اور ہندوستان کی طرف بڑھ چلے۔ انھوں نے ٹھنڈ میں لمبے راستے سے ہمالیہ کو پار کیا، ملک میں داخل ہوئے اور سندھ ندی پر پہنچ گئے۔ وہاں سکندر کی فوج اور ہندوستان کے پورس کی فوج کے درمیان لڑائی ہوئی۔ راجہ پورس کو شکست ہوئی اور اُسے قیدی بنالیا گیا۔ ہندوستان میں اپنی پہلی فتح کے ساتھ سکندر بہت خوش تھا۔

دن بھر کی لڑائی کے بعد جب سکندر کی فوج آرام کر رہی تھی، وہ اپنے گھوڑے بیوسیفلس پر سوار ہوا اور خاموشی سے ٹینٹ سے باہر نکل آیا۔ وہ ہندوستانی دیہات کا علاقہ مزید دیکھنا چاہتا تھا۔ سکندر سڑک پر آگیا اور اپنے گھوڑے کو آگے ہی آگے بڑھاتا چلا گیا۔ گھروں میں روشنی کے بغیر اندھیرا ہو گیا تھا۔ عورتیں رو رہی تھیں، بچے چلا رہے تھے۔ سکندر کو کوئی رحم نہیں آیا بلکہ اُس کو اپنی فتح پر فخر ہوا۔ تھوڑی دیر میں اُس نے اپنا رُخ جنگل کی طرف موڑ دیا۔ جب وہ آگے پہنچا اُس نے کچھ فاصلہ پر آگ جلتی ہوئی دیکھی۔ وہ نزدیک پہنچا تو اُس نے کچھ ہندوستانی سادھوؤں کو یگیہ کرتے ہوئے پایا۔ وہ ایک بڑے درخت کے تنے کی آڑ میں خاموشی سے کھڑا ہو گیا۔

سردیوں کے دن تھے ہوا چل رہی تھی اور بے انتہا ٹھنڈ تھی۔ سادھوؤں نے اپنے جسم کے



اوپر کے حصے پر کوئی کپڑا نہیں پہن رکھا تھا۔ سکندر نے خود سے سوچا "اوہ! وہ غریب ہیں اور ان کے پاس بدن ڈھانپنے کے لیے کچھ نہیں ہے۔ اُسے سادھوؤں پر ترس آیا، مجھے ان ننگے فقیروں کے لیے کچھ کرنا چاہیے! اب رات ہو چکی تھی۔ وہ واپس اپنے ٹینٹ گیا۔ اپنے چیف جنرل کو جگایا اور کہا۔

"جلدی سے موٹے اونی کمبل اور اونی کپڑے لاؤ۔ مجھے یہ چیزیں جلدی ہی چاہئیں۔"

موٹے کمبلوں اور اونی کپڑوں کا ڈھیر لایا گیا۔ تھوڑی ہی دیر میں انھیں گھوڑوں پر لاد دیا گیا اور سکندر انھیں اسی جنگل کی طرف لے گیا۔ یہ قافلہ وہاں جاکر رُک گیا جہاں سادھو کیمپ کر رہے تھے۔ سکندر نے دیکھا سادھو ابھی تک بھجن کیرتن کر رہے تھے وہ اپنے گھوڑے کو اور نزدیک لے آیا۔ سادھوؤں نے سکندر اور اس کے قافلے کی موجودگی کا کوئی نوٹس نہیں لیا۔ اُن کی توجہ اپنی طرف مبذول کرانے کے لیے سکندر نے اپنے گھوڑے کو تھپتھپایا اور کھنکھارا...... تب بھی کسی نے کوئی توجہ نہ دی۔ اب سکندر جھنجھلایا۔ وہ گھوڑے پر سے اُترا اور سب سے بوڑھے سادھو کے پاس گیا۔ سادھو نے اس پر بھی کوئی توجہ نہ دی۔ سکندر نے خود کو مکمل طور پر نظر انداز محسوس کیا۔ تب وہ ان میں سے ایک سادھو کے پاس گیا اور بولا "فقیر سنو! میں مشہور سکندر اعظم ہوں"۔

سادھو نے اوپر دیکھا اور بہت نرمی اور شگفتگی سے پوچھا:

"تم کیا چاہتے ہو؟ اے نوجوان! میں تمھارے لیے کیا کر سکتا ہوں؟"

سکندر کو اس سوال سے دھچکا سا لگا۔ ایک لمحے کے لیے اُس نے توقف کیا "اچھا...... اچھا" مجھے تم سے کچھ نہیں چاہیے۔ میں سکندر اعظم ہوں۔ میں نے تمھارا ہندوستان فتح کر لیا ہے"۔ سکندر نے فخر سے اعلان کیا۔ وہ کہتا رہا "جب میں نے اس ٹھنڈے موسم میں تم لوگوں کو ننگے بدن دیکھا، میں تم سب کے لیے اونی کمبل اور کپڑے لایا ہوں۔"

اُس سادھو نے ایک تیز نگاہ سکندر پر ڈالی۔ وہ قریب آیا اور اپنا ایک ہاتھ سکندر کے کندھے پر رکھا۔

"نوجوان تو تم ہو مشہور سکندر، جو لوٹ مار کر کے مُلک فتح کیا کرتا ہے؟" سادھو زور سے ہنسا

اور پوچھا" بولو نوجوان ایک ڈاکو کیوں کر فاتح ہو سکتا ہے اور کسی کو کچھ دے سکتا ہے ؟" اور سادھو نے سکندر کی آنکھوں میں گہرائی سے جھانکا۔

سکندر پیلا پڑ گیا۔ وہ نہیں سمجھ پا رہا تھا کہ کیا کہے۔ سادھو نے اپنی بات جاری رکھی۔ "ٹھیک ہے! میرے بچے اگر تم دنیا کو فتح کرنا چاہتے ہو پہلے محبت سے لوگوں کے دل جیتو۔ جہاں تک ہماری بات ہے، ہم نے دنیا تیاگ دی ہے اور ہم کو کچھ نہیں چاہیے۔ جو کچھ ہمارے پاس بچا ہے ہم اُسے بھی دے سکتے ہیں۔ اب بتاؤ تمھیں کیا چاہیے ؟"

سکندر کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ اُس نے اس سے پہلے کبھی ایسی باتیں نہیں سنی تھیں۔ جُرم کے احساس نے یکایک غمگین کر دیا۔ اُس نے سادھوؤں کو سلام کیا۔ بغیر کوئی لفظ بولے وہ اپنے گھوڑے پر سوار ہوا اور واپس اپنے کیمپ کی طرف روانہ ہوا۔ قافلہ اپنے مالک کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔

صبح ہو چلی تھی اور سکندر چڑیوں کی چہچہاہٹ سن سکتا تھا۔ اُس نے فیصلہ کر لیا تھا اور اس نے اپنی پیش قدمی روک دی۔ اُس نے راجہ پورس کو آزاد کر دیا اور ہندوستان کے دوسرے حصّوں کو فتح کرنے کے مستقبل کے ارادوں کو ترک کر دیا۔

جسما

اندھیرا تیزی سے پھیلتا جارہا تھا۔ ٹکم تیز تیز قدموں سے چل رہا تھا۔ وہ اپنی اچھی بیوی کے پاس واپس پہنچنے کے لیے بے چین تھا۔ اُس نے اپنے اوپری ہونٹ پر آتی پسینے کی بوندیں اپنی پگڑی کے ایک کنارے سے پونچھیں۔ ڈوبتے سورج کی چمپئی کرنیں زمین کے تقریباً متوازی پڑتے ہوئے زمین کے اُن حصّوں کو منور کر رہی تھیں جہاں دن کی روشنی میں نہیں پہنچی تھی۔ ٹکم نے ایک دُھن گنگنانا شروع کی جب وہ مڑا اور اس نے جسما کا ہیولیٰ دیکھا۔

وہ دروازہ کی ٹلی سے لگی کھڑی تھی۔ سورج کی نرم کرنیں اُس کے رنگ کو گلابی بنا رہی تھیں۔ ٹکم کو وہ کسی ماہر سنگتراش کے ذریعہ تراشا گیا مجسمہ لگ رہی تھی۔ یقیناً وہ ایسی ہی ہے۔ اُس نے دل ہی دل میں سوچا۔ وہ شاید بہترین عورت ہے جو خدا نے تخلیق کی ہے۔ خوب صورت، شریف، وفادار، منکسر، اُس کے منہ سے کبھی سخت لفظ نہیں سنا گیا۔ اوہو! میں کتنا خوش قسمت ہوں۔ اُس کو بیوی کے طور پر پاکر خوش قسمت ہوں۔ مجھے اور کیا چاہیے! جسما بہترین تحفہ ہے جو خدا مجھے دے سکتا تھا۔

جسما، ٹکم کو دیکھ کر مسکرائی۔ جیسے ہی وہ گھر کی سیڑھیوں کی طرف بڑھا وہ تھوڑا سا کھسک کر اُس کو راستہ دیتے ہوئے ایک طرف کو ہو گئی۔ پھر وہ اُس کے پیچھے آئی۔ اُس نے اُس کی پگڑی اُتاری، کپڑے اُتارنے میں اُس کی مدد کی اور اُس کے لیے ہاتھ منہ دھونے کے لیے ایک جگ میں پانی لائی۔ جب ٹکم صاف ہو کر آیا تو جسما اُس کے لیے گرم دودھ کا ایک پیالہ لائی۔

"جسما" ٹکم نے دودھ لیتے ہوئے کہا" مجھے پنت نگر کے راجہ سدھ راج کا ایک پیغام ملا ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ ایک ہزار مزدوروں کے ایک جتھے کی نگرانی کروں۔ راجہ وہاں ایک بڑا

تالاب کھدوا رہا ہے۔ کیا میں یہ پیش کش منظور کرلوں ؟ ہمیں وہاں مالوہ سے زیادہ روپے ملیں گے"۔

"یہ باتیں تمھیں طے کرنا ہیں۔ میں تمھارے ساتھ رہوں گی۔ جہاں بھی تم جاؤ گے ۔ میں اسی طرح خوش رہوں گی۔ چاہے تم کم کماؤ یا زیادہ۔ پیسہ ہی سب کچھ نہیں ہے۔ خوشی سب کچھ ہے"۔ جسما اپنی مدھر آواز میں بولی۔

ٹِکم ایک عام مزدور تھا۔ وہ اپنی محنت ،ایمان داری اور شرافت کی وجہ سے جانا جاتا تھا۔ اُس کی شہرت پٹن نگر جیسے دور دراز علاقے میں بھی پہنچ گئی تھی۔ اسی وجہ سے اُس کو یہ پیش کش ملی تھی۔

تالاب پر کام شروع ہوا۔ ٹکم نے ٹیم کے تال میل کو دیکھا۔ ایک ہزار مرد عورتیں، جنھیں ٹِکم اپنے ساتھ پٹن نگر لایا تھا۔ سخت محنت کر رہے تھے۔ اُن کا کام یوں ہی نہیں تھا۔ بس ایک ہی چیز تھی جسے ٹِکم برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ وہ تھی سُستی اور کاہلی۔ جسما نے بھی اُسی جگہ کام کیا۔ ٹکم نے اُسے بارہا کہا کہ اُسے کام کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اُسے تکلیف ہوتی تھی جب وہ اُسے مٹی کی بھاری ٹوکری اُٹھا کر چلتے ہوئے دیکھتا تھا، پسینے کے قطرے اُس کے گالوں سے ٹپک رہے ہوتے تھے۔ اُس نے کوشش کی کہ وہ گھر پر ہی رہے لیکن وہ دلیل پیش کر دیتی تھی۔ "میں سارا دن گھر میں بیٹھے کیا کرتی رہوں گی ؟ یہاں میں تمھارے ساتھ تو ہوں۔ یہ میرے لیے سب سے اچھی بات ہے"۔ ٹِکم لاجواب ہو جاتا۔ اس طرح وہ دوسروں کے ساتھ کام کرتی رہی۔ ایک دن جب تالاب کی کھدائی کا کام جاری تھا۔ راجہ سدھ راج کام کی رفتار کو دیکھنے آ پہنچے۔ وہ گڑھے کے ایک کونے پر کھڑے ہو گئے اور مزدوروں کو کام کرتا ہوا دیکھنے لگے۔ وہ مٹی اور پسینے سے اَٹے ہوئے اوپر نیچے آ جا کر اپنا کام کر رہے تھے۔ وہاں عورت مزدوروں کی بھی خاصی تعداد تھی۔ راجہ کی نظر جسما پر پڑی۔ وہ چہرہ تو نہیں دیکھ سکتا تھا۔ لیکن وہ عجیب لگ رہی تھی۔ اُس کو چلتے ہوئے بھاری مٹی کی ٹوکری کا بوجھ اُٹھاتے اور لے جاتے ہوئے اُس نے محسوس کیا کہ وہ غیر معمولی حسین اور خوب صورت لڑکی کو دیکھ رہا ہے۔

'اگر میں اس سے شادی کر سکوں اور اس کو اپنی بیوی کے طور پر رکھ سکوں۔ لیکن وہ جانتا تھا کہ جسما شادی شدہ ہے۔ لیکن اُسے پھر بھی حاصل کرنا ہی چاہیے، چاہے اُس کا کچھ بھی مطلب ہو"۔ اس نے فیصلہ کیا۔

اگلے دن راجہ نے جسما کے پاس ہلکارا بھیجا" جسما" ہلکارے نے اُسے مخاطب کیا۔" جی پنڈت جی" اس نے جواب دیا۔

" ٹِکم تم سے اس طرح کام کیوں کرواتا ہے؟ تم بہت خوب صورت اور گوری ہو۔ ایک عام مزدور کی بیوی کی طرح کام کر کے تم اپنی صحت کیوں خراب کر رہی ہو؟ سنو، جسما، اگر تم اسی طرح کام کرتی رہیں تو بے ڈول اور بھدی ہو جاؤ گی۔ ٹکم کو تمھارے ساتھ اس طرح نہیں کرنا چاہیے"۔

" مجھے اور ٹِکم کو اکیلا چھوڑ دو۔ ٹِکم میرا شوہر ہے اور جو وہ مجھ سے چاہتا ہے میں وہ کروں گی۔ میں نہیں سمجھتی سخت محنت سے خوب صورتی خراب ہو جاتی ہے۔ حقیقتاً محنت کر کے میں خود کو چاق و چوبند رکھتی ہوں۔ اس لیے میرے بارے میں فکر مت کرو۔ اور میری خوب صورتی کا تعلق صرف میرے شوہر سے ہے تم سے نہیں"۔ جسما نے سختی سے جواب دیا اور ہلکارے کو بات کو مزید بڑھانے کا موقع دیے بغیر وہاں سے چلی گئی۔

" سنو! جسما" ہلکارے نے اُسے واپس بلایا۔

" اب مجھے کام کرنا ہے۔ اس لیے مجھے جانے دو" اُس نے خود کو چھڑاتے ہوئے کہا۔

" اچھا، جب تمھیں سدھراج کا شاہی محل دیکھنے کا شوق ہو۔ میں تمھیں وہاں سے لے جا سکتا ہوں۔ تب تمھیں معلوم ہو گا امیری کیا ہوتی ہے۔ تمھیں ہر چیز حاصل ہو گی۔ جواہرات، نوکر چاکر، آرام، موسیقی، عطر اور خوشبوئیں۔ ہاں جو کچھ ایک عورت خواہش کر سکتی ہے۔ محل میں تمھارے لیے جگہ ہے۔ آؤ! ایک مرتبہ دیکھ لو وہاں عورتیں کس طرح رہتی ہیں۔ جب بھی تمھارا دل چاہے"۔ وہ بولتا رہا، جسما کے دماغ میں اُس کی بات کے بارے میں کوئی شک و شبہ نہیں رہ گیا تھا۔

" میں محل میں آنے کے بارے میں نہیں سوچ سکتی جب تک کہ میرے جسم میں جان ہے"۔

" تم ذہین ہو، تمھیں بہتر بات کو پسند کرنا چاہیے"۔ ہلکارے نے اُسے ہوشیار کرتے ہوئے کہا۔

" ٹِکم اور میں زندگی بھر ساتھ رہیں گے۔ ہم موت میں بھی ساتھ رہیں گے ...... " پھر وہ لمبے لمبے قدم بھرتی ہوئی چلی گئی۔

اس شام جسما کا موڈ ٹھیک نہیں تھا۔ اُس نے اپنا منہ نِکم کے کندھوں پر رکھ دیا اور اپنی دکھ بھری بپتا سنائی۔

"آؤ ہم یہاں سے چلیں، ہمیں جانا چاہیے۔ آج ہی کی رات مجھے بہت غصہ آرہا ہے۔"

نِکم کی آنکھیں دہکتے ہوئے کوئلوں کی طرح سُرخ ہو گئیں۔ اُس نے اپنے چوغے میں چھپا ہوا خنجر نکالا۔ اُس نے جسما سے کہا" وہ بد معاش! راجہ اپنی رعایا اور اس کی عزت کا محافظ ہوتا ہے اور وہ ایک دوسرے شخص کی بیوی کو چاہتا ہے! میں اُس کو مار ڈالوں گا۔ اُس نے تمھارے اوپر نظر ڈالی ہے۔"

"بے وقوف مت بنو، میرے پیارے! راجہ طاقت ور ہے۔ تم اُس تک نہیں پہنچ پاؤ گے۔ سپاہی تمھیں پکڑ لیں گے۔ نہیں، ہمیں یہ جگہ چھوڑ دینا چاہیے۔ ہمیں آج کی رات ہی چلے جانا چاہیے۔ میں یہاں نہیں رکوں گی۔ ایک لمحے کے لیے بھی نہیں" جسما کے آنسو اُس کے اندر کے دکھ کو ظاہر کرنے کے لیے باہر آگئے۔

"ٹھیک ہے، جسما" نکم نے اُسے دلاسہ دیا۔ "میں ایک درجن آدمی اپنے ساتھ لوں گا جو میرے قریبی دوست ہیں۔ ہم اُنھیں اپنے ساتھ لے جائیں گے تاکہ اگر راجہ کے آدمیوں نے ہمارا پیچھا کیا تو ہم اُس کا اچھی طرح مقابلہ کر سکیں گے۔"

"اوہ! کاش ہم نے مالوہ نہ چھوڑا ہوتا، اگر ہم وہیں رہتے"۔ جسما کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔

اُس وقت بالکل اندھیرا تھا جب نکم، جسما اور ایک درجن دوسرے لوگ سڑک پر چلے جارہے تھے۔ وہ چپ چاپ چلتے رہے۔ یہاں تک کہ شہر سے باہر آگئے۔ پھر وہ پگڈنڈی پر جو زمین کی صفائی سے بن گئی تھی چلنے لگے۔ ستارے جھلملا رہے تھے جس وقت یہ لوگ راستہ طے کر رہے تھے اور پنت نگر سے دور سے دور چلے جانا چاہتے تھے۔

وہ تمام رات چلتے رہے اور سورج نکلنے کے بعد بھی اپنا سفر جاری رکھا۔ اُن کے پاؤں دُکھنے لگے تھے۔ اُن کے پیروں میں چھالے پڑ گئے تھے۔ پھر بھی وہ چلتے ہی رہے۔ وہ محفوظ جگہ پر پہنچ جانا چاہتے تھے۔ اس سے پہلے کہ اُن کے فرار کی خبر راجہ کو ہو۔ وہ بھٹک ہی رہے تھے کہ انھیں

گھروں کی آوازیں سنائی دیں۔ آواز بہت دھیمی تھی اور فاصلے سے آ رہی تھی۔ یہ تیز ہوتی گئی ۔ ٹکم نے اپنے دوستوں کی طرف دیکھا، "میرا خیال ہے راجہ اور اُس کے آدمی ہمارے پیچھے ہیں، اب ہمیں کیا کرنا چاہیے ؟"

"اب صرف ایک ہی راستہ بچا ہے۔ ہم لڑیں۔ آخر دم تک لڑیں" اُس کے دوستوں میں سے ایک نے رائے دی۔

"میں خود کو مجرم محسوس کر رہا ہوں، تم میری خاطر کیوں مرو؟ تم چلے جاؤ، میں رُکا رہوں گا اور راجہ سے لڑائی کروں گا"۔ ٹکم نے کہا۔

اس سے پہلے کہ بحث پوری ہوتی۔ راجہ اور اُس کے آدمی گھوڑوں پر سوار جھاڑیاں چیرتے ہوئے آ گئے۔ انھوں نے دھمکی کے طور پر اپنی تلواریں لہراتے ہوئے ان لوگوں سے ہتھیار ڈالنے کو کہا اور اس گروپ کی گھیرابندی کر لی۔ ٹکم نے اپنا خنجر نکالا اور ہٹتے اور بچتے ہوئے کچھ وار صاف کیے۔ لیکن وہ زیادہ دیر تک مقابلہ نہ کر سکا۔ جلدی ہی ایک کاری ضرب سے وہ نیچے گر پڑا۔ ٹکم، زمین پر لڑھکا، کراہتے ہوئے بولا "جسما، او جسما اب تیرا کیا ہوگا؟"

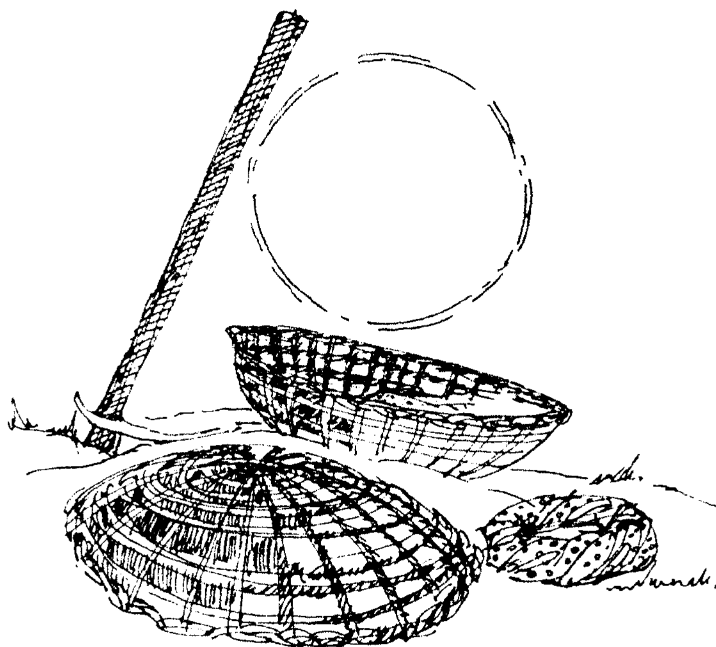
راجہ جو لڑائی میں منہمک تھا، جسما کی طرف متوجہ ہوا۔ وہ خوش تھا۔ وہ پُر مسکراہٹ سے اُس کا انتظار کرنے لگا۔

جسما اُس کا سر اپنی گود میں رکھ کر اُس کو آخری لمحوں میں دلاسہ دینے کے لیے ٹکم کی طرف دوڑنا چاہتی تھی۔ لیکن وہ جانتی تھی اس سے بھی زیادہ ضروری ایک کام اور تھا۔ پل بھر میں اُس نے ایک خنجر جو اُس نے اپنے لباس میں چھپا رکھا تھا، نکال لیا۔ وہ اس جگہ کے قریب پہنچ گئی۔ جہاں ٹکم پڑا ہوا تھا۔ اور ایک زبردست وار کے ذریعے اپنے بھونک لیا۔ اُس نے خنجر باہر نکالا تو خون باہر کی طرف اُبل پڑا۔ وہ چھپٹائی اور ٹکم کے اوپر گر گئی۔ ایک سیکنڈ کے لیے اُس نے اپنا چہرہ اوپر اٹھایا۔ راجہ کو غصہ سے گھورا اور بولی "تم مجھے نہیں حاصل کر پاؤ گے ۔ کبھی نہیں۔ میں ختم ہو چکی ہوں اپنے شوہر کے ساتھ ۔ چلا جا، بد بخت ۔ جا، واپس اپنی دولت میں لوٹ جا۔ لیکن میں جانتی ہوں۔ میں جانتی ہوں کہ جو تالاب تو کھود رہا ہے، اُس تالاب میں کبھی پانی نہیں ہوگا۔ کبھی نہیں......"

راجہ سانس روکے دیکھتا رہا۔ اُس نے شرم سے اپنا سر جھکا لیا۔ پھر وہ اپنے گھوڑے کی طرف



مڑا اور اُس پر سوار ہو گیا اور تھوڑی دور جا کر اُس نے سر اُٹھا کر اُس خوف ناک منظر کی طرف آخری نگاہ ڈالی۔ نلم اور جسامر چکے تھے۔ وہ ایک دوسرے کے برابر لیٹے ہوئے تھے۔ وہ زندگی میں ساتھ رہے تھے۔ وہ موت میں بھی ایک ساتھ تھے۔



خفیہ راستہ

بالو نے فرش پر چٹائی بچھائی، پانی کا گلاس بھرا اور کھانے کے لیے بیٹھ گیا۔

"صرف کچھ منٹ اور،" اس کی ماں نے سبزی کی پتیلی میں چمچہ چلاتے ہوئے کہا۔ بالو کو اب اُس کی چوڑیوں کی کھنکھناہٹ سنائی نہیں دیتی تھی۔ اُس کے ہاتھ اُن کے بغیر ننگے لگتے تھے۔ اُس نے اپنے عمدہ کپڑوں پر نظر ڈالی۔ اُسے یاد آیا کہ کس طرح اس کی ماں نے اپنی آخری چوڑی دیوالی پر اُس کے لیے کپڑے خریدنے کے لیے بیچ دی تھی۔ اُس نے اپنے لیے کچھ نہیں خریدا تھا۔

"لو کھاؤ" ایک نرم چپاتی اور کچھ گرم سبزی اس کے سامنے پروستے ہوئے وہ بولی۔

"م۔ م۔ مزے دار" بالو نے زور سے کہا۔ "ماں تم جانتی ہو اگر میرے پاس بہت سے پیسے ہوتے میں تمھیں کبھی کام نہیں کرنے دیتا"۔

"تم اور کیا کروگے اگر تمھارے پاس بہت سے پیسے ہوں؟" اُس نے اُس کے بالوں کو محبت سے چھیڑتے ہوئے کہا۔

"میں تمھارے لیے ہاتھ بھر کر چوڑیاں خریدوں گا"۔

اُس کی ماں مسکرائی اور اُس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ "تمھارا یہ کہنا ٹھیک ہے لیکن مجھے کوئی سچ مچ چوڑی ووڑی نہیں چاہیے"۔ اُس نے کہا لیکن بالو جانتا تھا کہ چوڑیاں پہننے کا اُسے کتنا شوق تھا ۔ کھانے کے بعد اُس نے اپنی ماں سے کہا کہ وہ پہاڑی پر بنے 'ریڑی' قلعہ جائے گا۔

اُس کی ماں کو تعجب ہوا۔ اُسے معلوم تھا کہ بہادر شیواجی اور اُس کا خاندان قلعے میں آنے والا

ہے اور سوائے خدام کے کسی کو قلعے میں داخل ہونے کی اجازت نہیں ہے۔" "کیا تمھیں محافظ قلعے میں داخل ہونے سے نہیں روکیں گے؟" اُس کی ماں نے سوال کیا" نہیں، وہ مجھے اندر داخل ہوتا ہوا نہیں دیکھیں گے"۔ اس نے جواب دیا۔

اُس نے سوالیہ نظروں سے اُس کی طرف دیکھا۔ اُس کے ذہن میں ایک سوال اُبھر رہا تھا، وہ جانتی تھی کہ پہاڑی پر اوپر جانے میں کافی وقت لگتا ہے۔ کیوں کہ وہ ڈھلوان ہے اور چڑھائی بہت مشکل ہے۔ لیکن بالو آنے جانے میں اُس سے بھی کم وقت لیتا تھا جتنا کہ دوسرے لوگ قلعے کے صدر دروازہ تک پہنچنے میں لگاتے تھے۔ "مجھے بتاؤ تم کس طرح اتنی جلدی قلعے تک پہنچ کر واپس آجاتے ہو؟" اُس نے بالو سے پوچھا۔

"یہ ایک دوسرا راز ہے"۔ اُس کا بیٹا دانت نکالتا ہوا بولا اور دور بھاگ گیا۔

بالو کافی دیر تک کھڑا پہاڑی پر بنے اُس شان دار قلعے کو دیکھتا رہا۔ یہ پہاڑی 'سہیادری' پہاڑی سلسلے کا حصہ تھی۔ یہ آس پاس کی پہاڑیوں میں سب سے اونچی تھی اور شیوا جی نے اُس کو اپنا صدر دفتر بنانے کا فیصلہ کیا تھا۔ اُس نے 'ریڑی' کا نام تبدیل کر کے اب 'رائے گڑھ' رکھ دیا تھا۔ لیکن مقامی لوگ اُس کو اب تک رائے ڑی کے نام سے ہی پکارتے تھے۔ یہ فیصلہ کرنے کے فوراً بعد شیوا جی نے اپنے وزیر ابا جی سونڈا کو رائے گڑھ کی قلعہ بندی کرنے، اور اس میں عمارتیں اور محل بنوانے کے لیے مقرر کر دیا تھا۔ بالو کو قلعے کے اندر جا کر تعمیراتی کام کو دیکھنا بہت اچھا لگتا تھا۔ اُسے تعجب ہوتا تھا کہ کتنی جلدی یہ چھوٹی سی سونی جگہ ایک پُر رونق شہر میں تبدیل ہو گئی تھی۔

بالو نے چاروں طرف دیکھا کہ کوئی اُسے دیکھ تو نہیں رہا ہے اور پھر اُس نے خاموشی سے ایک خفیہ راستہ سے جو قلعہ میں ایک پوشیدہ جگہ نکلتا تھا، چڑھنا شروع کر دیا۔ جب وہ بہت چھوٹا تھا تب اُس نے اتفاق سے وہ راستہ کھوج لیا تھا لیکن اُس نے اس کے بارے میں کسی کو نہیں بتایا تھا ۔ اُسے پہاڑی کی چوٹی پر پہنچنے میں زیادہ وقت نہیں لگا۔

اُس نے نیچے قطار در قطار پہاڑیوں کو اپنے چاروں طرف دیکھا اور سوچا کہ شیوا جی کتنا ہوشیار ہے کہ اُس نے اس قلعے کو اپنا صدر مقام بنایا۔ کیوں کہ یہ اس انداز سے واقع ہوا تھا کہ دشمن کی کوئی بھی فوج اس پر اچانک حملہ نہیں کر سکتی تھی۔

بالو چپکے سے خفیہ راستے سے قلعے کے اندر کھسک گیا۔ یہ ایسا تھا جیسا کہ دوسری دنیا میں پہنچ

جانا۔ آس پاس بہت کچھ ہو رہا تھا۔ مختلف قسم کی بہت سی آوازیں آ رہی تھیں۔ بالو کو جگد یشورا مندر سے ناقوس اور جانجھ کی آوازیں آ رہی تھیں۔ گانے والیوں کے گھروں سے پازیب کی جھنکار، برہمنوں کے مکانوں سے گھنٹیوں کے ساتھ ساتھ، سنتریوں کی آوازیں، اصطبلوں سے ہاتھیوں کے گلے کی گھنٹیوں اور گھوڑوں کے ہنہنانے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ سب سے پُر شور جگہ بازار تھا۔ بیس دو کانوں میں وہ سب کچھ بک رہا تھا جس کا کوئی شخص خیال کر سکتا تھا۔ دو صاف ستھری قطاروں میں دو کانیں واقع تھیں۔ اور دو کان دار اپنی اپنی چیزوں کی آوازیں لگا رہے تھے۔ اچانک بالو نے دو دو کان داروں کی آپس کی گفتگو سنی۔

"شیوا جی جلدی ہی اپنے خاندان کے ساتھ یہاں منتقل ہو جائیں گے"۔ ایک دو کان دار نے دوسرے سے کہا۔

"ہاں اب اس کی اُمید کی جا سکتی ہے کیوں کہ اب ویا نکو جی نے قلعوں کو مکمل کر لیا ہے" دوسرے نے جواب دیا۔

بالو، چلنے ہی والا تھا کہ دو کان دار کے الفاظ نے اُسے اپنی جگہ پر روک دیا، "تمہیں معلوم ہے" شیوا جی اس قلعہ بندی سے پورے طور پر مطمئن نہیں ہیں۔ اُن کا خیال ہے کہ کوئی خفیہ راستہ باقی ہے جہاں سے دشمن اندر آ سکتا ہے۔

بالو، بالکل ساکت کھڑا رہ گیا۔ وہ سانس بھی لینے کی ہمت نہیں کر رہا تھا۔

"تمہیں کیسے معلوم؟"

"کیا تم نے نہیں سنا؟ شیوا جی نے اُس شخص کے لیے ایک بڑے انعام کا اعلان کیا ہے، جو قلعے میں صدر دروازے کے علاوہ کسی دوسرے راستہ سے داخل ہو سکتا ہو"۔

بالو، وہاں سے چل پڑا۔ اُس کے دماغ میں اُتھل پتھل مچی تھی۔ "ایک بڑا انعام !" الفاظ اُس کے دماغ میں گونج رہے تھے۔

یہ موقع آیا ہے امیر بننے کا! لیکن اس کا مطلب ہو گا کہ وہ ایک ایسے راز سے ہاتھ دھو بیٹھے، جس کو اتنے لمبے عرصے تک اُس نے چھپائے رکھا! وہ کسی کو بھی اپنا قیمتی راز بتانا نہیں چاہتا تھا۔ دنیا کی تمام دولت کے بدلے میں بھی نہیں۔

جب وہ گھر پہنچا تب بھی وہ اُسی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

"کیا تم نے شوا جی کا اعلان سنا؟"

اُس کی ماں نے جیسے ہی اُسے دیکھا سوال کیا۔ یہ بات بہت تیزی سے پھیل گئی تھی اور گاؤں میں ہر کوئی اس کے بارے میں جانتا تھا۔

"انعام میں سونے کے سکوں سے بھرا ایک تھیلا اور ایک بھاری کنگن؟" وہ کہہ رہی تھی، "تمھارے خیال میں کیا کوئی انعام جیت پائے گا؟"

اُس نے ماں کی آواز میں چاہت پائی۔ اُس کے خالی بازوؤں کو دیکھا اور اپنا ذہن بنالیا۔ وہ اپنی ماں کے لیے کنگن حاصل کرلے گا چاہے اس کا مطلب ہو اپنے راز کی قربانی۔

شام کو وہ اٹھ بیٹھا اور ایک بڑا سا رنگین پھریرا (جھنڈا) بنایا۔ اگلی صبح ہاتھ میں جھنڈا لیے وہ شیوا جی کے سامنے پیش ہوا۔

شیوا جی کو تعجب ہوا جب اُس نے دعویٰ کیا کہ وہ قلعہ میں جانے کا ایک خفیہ راستہ جانتا ہے۔ اُس وقت تک سپاہی سینکڑوں مرتبہ پہاڑوں کو کھنگال چکے تھے اور ناکام رہے تھے اور اب شیوا جی کو یقین ہو چلا تھا کہ کوئی خفیہ راستہ نہیں ہے۔ لیکن وہ لڑکے کو مایوس بھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس لیے شیوا جی نے اُسے کوشش کرنے کی اجازت دے دی اور بالو اپنے ہاتھ میں جھنڈا لیے بھاگ گیا اور درختوں کے درمیان غائب ہو گیا۔

شیوا جی نے اپنے ایک آدمی سے دریافت کیا۔

"یہ نوجوان کون ہے؟" "میرے آقا، یہ لڑکا ذات سے مہار ہے اور وہ اپنی ماں کے ساتھ گاؤں میں رہتا ہے"۔

جلدی ہی وہ لڑکے کے بارے میں بھول گئے اور سلطنت کے معاملات پر بات چیت کرنے لگے۔ تھوڑی دیر بعد وزیروں میں سے ایک نے اوپر کی طرف دیکھا اور چلایا "ناممکن! شیوا جی سمیت ہر شخص دیکھنے کے لیے گھوما اور جو کچھ انھوں نے دیکھا اُسے دیکھ کر ہر شخص دم بخود رہ گیا۔ کیوں کہ چوٹی کے ٹھیک اوپر انھوں نے جھنڈا ہلاتے ایک ہیولے کو دیکھا۔ وہ جھنڈا بہادر لڑکے کا تھا!

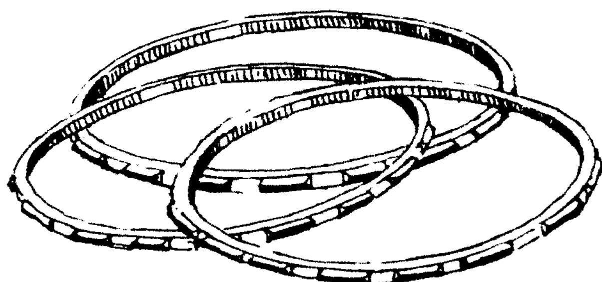
بالو، کو بلایا گیا اور شیوا جی نے خود اپنے ہاتھوں سے وعدہ کے مطابق انعام دیا۔

شام کو جب بالو نے اپنی ماں کو سونے سے بھرا تھیلا دیا اور سونے کا کنگن اُس کے بازو میں ڈالا تو وہ اتنی جذباتی ہو گئی تھی کہ وہ زار و قطار رونے لگی تھی۔ بالو نے اپنی ماں کے چہرے کو دیکھا اور



محسوس کیا کہ اُس نے جو خطرہ مول لیا تھا وہ اس خوشی کے مقابلے میں کچھ نہیں تھا، جو اُس نے اپنی ماں کو دی تھی۔

اُسی دن شیواجی نے دروازہ لگا کر اُس راستے کو بند کرادیا۔ یہ دروازہ آج بھی رائے گڑھ کے قلعے میں موجود ہے اور اُسے 'چور دروازہ' کہا جاتا ہے۔



امتحان

"تمھارا پیپر کیسا ہوا؟" اماں نے پوچھا۔

"اوہو! بہت عمدہ"، میں نے بیڈ پر اپنا بستہ پھینکتے ہوئے جواب دیا۔ "ابھی تک میں نے سب پیپر بہت عمدہ کیے ہیں۔ یقیناً میں بورڈ کے سلیکشن ٹیسٹ میں ٹاپ کروں گی"۔

"لیکن کیا کل تمھارا کوئی پیپر نہیں ہے؟" اماں نے دریافت کیا۔

"حساب! آپ کو تو معلوم ہی ہے۔ یہ میرا کتنا پسندیدہ مضمون ہے۔ ہر چیز میری انگلیوں پر ہے"۔

"کل تمھیں ذرا جلدی جانا ہوگا۔ میں چاہتی ہوں کل تم جاتے ہوئے راستہ میں گنیش کے مندر میں ناریل چڑھاتی جانا۔ اُس دن تمھاری سالگرہ ہے اور جمعہ کا مبارک دن ہے۔ اسے بھی ساتھ لیتی جانا......"

"لیکن مجھے امتحان کے لیے دیر ہو جائے گی......"

"اسی لیے تو میں تمھیں جلدی جانے کے لیے کہہ رہی ہوں۔ تم اپنے ماموں اور ممانی کے لیے کھیر بھی لیتی جانا۔ یہ سب راستہ میں ہی ہیں"۔ اماں نے کہا اور جلدی سے کچن میں چلی گئیں۔

"ٹھیک ہے، اماں، لیکن ابّا کہاں ہیں؟ انھیں آج صبح واپس آجانا چاہیے تھا۔ کیا انھیں آج نہیں آنا تھا؟"

"ان کا کام ابھی ختم نہیں ہوا ہے۔ انھوں نے فون کر کے بتایا تھا کہ وہ کل شام کی ٹرین سے آ رہے ہیں"۔

"اوہ!" میں مایوس ہو کر بولی "انھوں نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ آج شام ہم سب کو فلم دکھانے لے جائیں گے"۔

کیوں کہ حساب میں پڑھنے کے لیے کچھ نہیں تھا اور میری بہن اُما اور بھائی ہری کے امتحان ابھی تین ہفتہ دور تھے۔ ہم نے وہ شام کیرم کھیلتے ہوئے گزاری۔

صبح میں جلدی نہائی اور نیا اسکرٹ اور بلاؤز، جو میری ماں نے میری سالگرہ کے لیے سلوائے تھے، پہنے۔ یہ میرے پسندیدہ رنگوں کے میل کے تھے۔ یہ گہرے ہرے رنگ کا تھا اور اس میں پیلی زری کا بارڈر تھا۔ میں نے ہرے رنگ کی بندی ماتھے پر لگائی، پوجا کے کمرے میں گئی، دیا جلایا، اور اگربتی جلائی اور پوجا کرنے لگی۔ ماں ایک لمحے کے لیے مجھے دیکھنے کے لیے آئیں کہ آیا میں تیار ہو گئی ہوں۔ میں نے اُن کے پاؤں چھوئے۔

"سال گرہ مبارک ہو، دیدی!" (بڑی بہن) اُما اور ہری چلائے اور مجھ سے لپٹ گئے۔ "تم بہت چمک مار رہی ہو"۔ ہری نے اپنی جیب سے ایک کارڈ نکالا اور مجھے دیا۔

"شان دار!" میں نے اُس کے ہاتھ کے بنے ہوئے کارڈ کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "کیا یہ ساری پینٹنگ تم نے خود بنائی ہے؟"

"اماں نے کچھ مدد کی تھی، لیکن بہت تھوڑی"۔ اُما بولی۔

"کیا تمھیں یہ پسند؟"

"یقیناً! یہ بہت عمدہ ہے! شکریہ!" میں نے انھیں چمٹاتے ہوئے کہا۔ "اور اب جاؤ اور اپنے بستے تیار کر لو، جلدی"۔

جلدی سے میں نے اپنے اسکول کی ڈریس پہنی اور اپنا ناشتہ نگلا۔ ہم کار میں بیٹھ گئے۔ ماں نے ناریل اور بادام کی کھیر کا ڈبہ سیٹ پر میرے برابر رکھ دیا۔

"وِنی، بھگوان کرے تمھیں کامیابی حاصل ہو۔ اپنا پیپر اچھی طرح کرنا"۔ انھوں نے کہا۔

"گڈ بائی"۔ جیسے ہی ڈرائیور نے گاڑی اسٹارٹ کی ہم نے ایک آواز میں کہا۔ جیسا کہ ماں نے ہدایت کی تھی مندر میں، میں نے ناریل پھوڑا اور خاموش کھڑی پرارتھنا کرتی رہی۔ پروہت نے بھگوان کی آرتی اُتاری اور ہمیں پرساد دیا۔ میں نے آرتی کی پلیٹ میں ایک روپے کا سکہ ڈالا اور اپنی گھڑی دیکھی۔

"جلدی کرو! دیر ہو رہی ہے" جیسے ہی ہم سب کار میں بیٹھے میں نے ڈرائیور سے کہا۔ "ہم ان دونوں کو اسکول چھوڑ دیں گے پھر ایک منٹ کے لیے مامی کے گھر جائیں گے"۔

جس لمحے میں نے مامی کا گھر دور سے دیکھا میں نے ہوشیار ہو گئی اور جیسے ہی کار نے رُکنے کے لیے بریک لگائے میں نے باہر کی طرف چھلانگ لگائی اور دروازے کی طرف لپکی اور دروازے کی گھنٹی بجائی۔ کوئی جواب نہیں ملا۔ نہ ہی کسی کے قدموں کی آواز اندر سے سنائی دی۔ میں نے دوبارہ گھنٹی بجائی۔ "ٹرن"۔ وہ بجی۔ کوئی جواب نہیں آیا۔ میں نے چاروں طرف نظر ڈالی۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ اوہ بھگوان! میں نے اپنے گھڑی کو دیکھا۔

وقت ہاتھ سے نکلا جارہا تھا۔

"مامی!" مامی! میں نے آواز لگائی اور دروازے پر گھونسہ مارا۔ میں بھونچکی رہ گئی، وہ کھل گیا۔ دروازہ بند نہیں تھا۔ جلدی سے میں اندر داخل ہوئی۔ میرا دل رُک گیا۔ مجھے ایک اور دھچکا لگا۔ مامی صوفے پر پڑی ہوئی تھیں اور دونوں ہاتھوں سے اپنا سینہ پکڑے ہوئے تھیں۔ سبزیوں کی ٹوکری، دری پر گری پڑی تھی اور آلو اور پیاز بکھرے پڑے تھے۔ مامی سبزی لے کر ابھی لوٹی ہوں گی"۔ یہی وجہ ہے کہ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ پھر وہ بے ہوش ہو گئی ہوں گی۔

مامی کی سانسیں کھنچی ہوئی تھیں اور ان کی نبض بہت دھیمی چل رہی تھی۔ اسکول میں اپنے فرسٹ ایڈ کے سبق کو دھیان میں رکھتے ہوئے میں نے ان کے سینے کی زور زور سے مالش کی۔ شاید اُن کو پہلے کی طرح دورہ پڑا تھا۔ میں جانتی تھی کہ مامی دل کی مریض ہیں۔ وہ پیلی پڑ گئی تھیں اور اُن کا بدن ٹھنڈا اور چپچپا ہو گیا تھا۔ ان کے چہرے، پیشانی اور گردن پر پسینے کے قطرے چمک رہے تھے۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ جہاں کہیں جاتیں ہمیشہ اپنے ساتھ اپنے درد کی گولیاں اپنے ساتھ رکھتی تھیں۔

"سلمان!" میں ڈرائیور کو آواز دیتے ہوئے دروازے کی طرف بھاگی "سلمان، جلدی۔ مامی بہت بیمار ہیں۔ ماما کو بلاؤ"۔ میں نے ہدایت دی اور واپس بیڈروم میں دوڑی۔ وہاں میز پر سفید پلاسٹک کا ایک ڈبہ رکھا تھا۔ جس پر 'ریڈ کراس' کا بڑا سا نشان بنا ہوا تھا۔

اُس کو کھولنے پر اس میں عام گھریلو استعمال کی چند دوائیں اور گولیوں کی ایک شیشی ملی۔ اُس کے لیبل پر ایک نگاہ ڈالتے ہوئے میں نے پڑھا 'سب لنگول ٹیبلیٹ'۔ مجھے اپنی گرل گائیڈ انسٹرکٹر کی بات یاد آئی کہ 'سب لنگول' کا مطلب ہوتا ہے 'زبان کے نیچے' اور وہ گولیاں دل

کے مریض کے لیے ہوتی ہیں۔ میں نے بوتل سنبھالی اور آنٹی کے پاس واپس بھاگی آئی۔ میں نے انھیں آہستہ سے ہلایا۔ جیسے ہی انھوں نے حرکت کی میں نے اُن سے منہ کھولنے کو کہااور میں نے ایک گولی اُن کی زبان' کے نیچے رکھ دی۔ اس کا فوری طور پر اثر ہوا۔ جیسے ہی گولی گھلی اور جذب ہوئی آنٹی کے چہرے کی رنگت لوٹنے لگی۔ ان کی آنکھیں آہستہ سے کھلیں اور وہ آہستہ آہستہ بیٹھ گئیں۔

میں نے اُن کی پیشانی تھپتھپائی اور بولی "مامی! آپ بالکل ٹھیک ہیں۔ ماما آتے ہی ہوں گے"۔

مامی کے ہونٹ کچھ کہنے کے لیے کھلے لیکن اُن کی آنکھیں غنودگی سے بند ہو گئیں۔

"اوہ، بھگوان، وہ ڈوب رہی ہیں؟ میں دل ہی دل میں بڑبڑائی "سلمان" میں گھبراہٹ میں چلائی۔ تقریباً اُسی وقت سلمان ڈرائنگ روم میں گھسا اور بولا، "بے بی، ماما آفس میں نہیں ہیں"۔

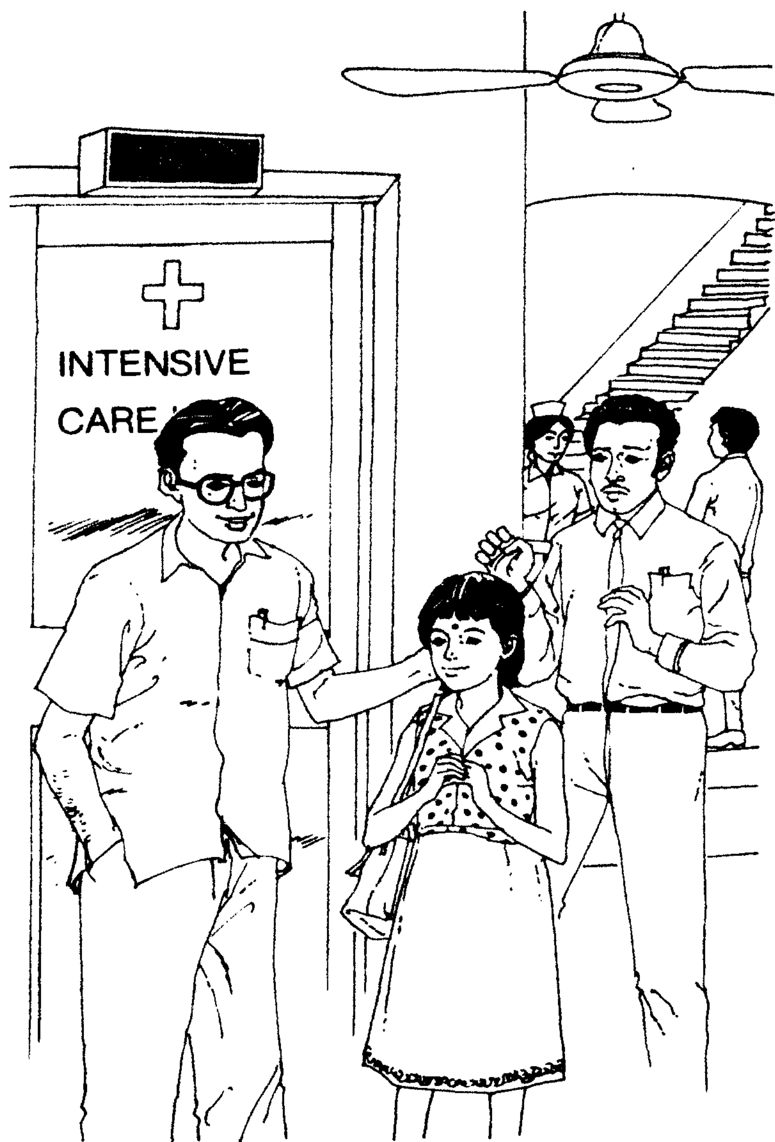
"اوہ، نہیں، ہم اُن کا انتظار نہیں کر سکتے۔ دیکھو، مامی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہو رہی ہے"۔ میں سانس لینے کے لیے رُکی اور میرا امتحان۔ میں نے سوچا۔ لیکن فوراً ہی اس خیال کو ذہن سے جھٹک دیا۔ مامی کی زندگی خطرے میں ہے۔ "سلمان جلدی سے ہمیں انھیں اسپتال لے جانا چاہیے"۔

"بے بی، تمھارا...... امتحان......" اُس نے یاد دلایا لیکن مامی کو کس طرح اسپتال پہنچایا جائے۔ یہ مسئلہ سر دست میرے لیے پریشانی کا باعث تھا۔ "جلدی کرو، سلمان" میں چیخی۔

ہم دونوں مل کر مامی کو کار تک لے گئے اور انھیں پیچھے کی سیٹ پر لٹا دیا۔ میں اُن کے برابر بیٹھ گئی۔ کار فراٹے بھرنے لگی۔ تمام راستے میں نے مامی کی کلائی پکڑے رکھی، اور اُن کی نبض تلاش کرتی رہی' جو میرے ناتجربہ کار ہاتھوں میں کبھی کبھی دھڑکتی۔ اب نو بج چکے تھے۔

میرا امتحان شروع ہو گیا ہوگا'۔ میں نے سوچا، لیکن اگلے ہی لمحے مامی کی ایک ہلکی سی ہچکی نے میری ساری توجہ پھر مامی کی طرف کر لی۔ کار اسپتال میں داخل ہو گئی۔

فوراً ہی مامی کو بہت دیکھ بھال والے شعبے (I.C.U) میں لے جایا گیا۔ جیسے ہی مامی ماہرین کی دیکھ بھال میں پہنچیں، میں ماما اور اماں کو فون کرنے دوڑی۔ ماما اپنی سیٹ پر پہنچ چکے تھے "جیسے ہی میں نے انھیں اطلاع دی وہ نرمی سے بولے"۔ "میں پہنچ رہا ہوں"۔


INTENSIVE
CARE

جیسے ہی ماما لابی میں پہنچے اُسی وقت ڈاکٹر مسکراتے ہوئے باہر آئے ''اچھا تو تم اپنی ماں کو لائی تھیں''، انھوں نے کچھ شک بھرے انداز میں پوچھا۔

''ہاں''، میں بُدبُدائی۔ ''بہادر لڑکی''، ڈاکٹر نے میرے کندھے تھپتھپائے، ان کی حالت قابو سے باہر ہو سکتی تھی اگر کچھ دیر ہو جاتی۔ تم نے ایک زندگی بچائی ہے، میری بچّی''۔

میرا تناؤ کم ہو گیا۔ میرے دل سے ایک بڑا بوجھ اتر گیا میں نے دیکھا ماما مجھے چمٹا رہے تھے۔

''وِنّی'' میری پیاری بچی'' انھوں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا

اب مجھے اپنے امتحان کا دھیان آیا اور میں نے اپنی گھڑی دیکھی۔ اب پونے دس بج چکے تھے۔ اچانک ماما نے پوچھا ''لیکن، تم یہاں کیا کر رہی ہو، وِنّی؟ میرا خیال تھا آج صبح تمھارا امتحان تھا۔ اب پونے دس بج چکے ہیں!''

میں نے سر ہلایا۔ ''میرا امتحان ہے، میرا خیال ہے میں اسکول پہنچ جاؤں گی''۔ میں نے گھبرا کر کہا۔

انھوں نے محبت سے مجھے اپنے بازوؤں میں لے لیا۔ مجھے کار تک لے گئے ''اب جلدی کرو۔ میں ماں کی دیکھ بھال کر لوں گا۔ بھگوان تمھارا بھلا کرے۔

''تیز۔ اور تیز'' میں بار بار کہتی رہی اور کار بھیڑ بھاڑ والی سڑکوں پر دوڑتی رہی۔ سارے راستے سلمان مجھے تسلّی دینے کی کوششیں کرتا رہا۔ ہمیں تین کلو میٹر کا فاصلہ طے کرنا تھا اور ایسا لگتا تھا جیسے ہمارا سفر کبھی ختم نہیں ہوگا۔ آخر کار، جب ہم اپنی منزل پر پہنچے تو میری گھڑی دس بجا رہی تھی۔

میں لمبے قدموں کے ساتھ لڑکھڑاتی ہوئی، ہال سپروائزر کے پاس پہنچی۔

'' مجھے افسوس ہے کہ مجھے دیر ہو گئی ہے''۔ میرے منہ سے الفاظ نکلے۔

انھوں نے ہمدردانہ نظروں سے مجھے دیکھا اور پھر مجھے دکھاتے ہوئے اپنے گھڑی کی طرف دیکھا۔

میں بُت بنی کھڑی تھی مجھے ان کی آواز سنائی دی۔ مجھے افسوس ہے، میری بچی،، تم آدھے گھنٹے کی چھوٹ سے بھی اکتیس منٹ زیادہ لیٹ ہو۔ میں اصول توڑ کر تمھیں امتحان میں بیٹھنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ کیا میں ایسا کر سکتا ہوں؟''

میں نے اپنا سر ہلایا۔ '' مجھے افسوس ہے''، انھوں نے دوبارہ کہا۔

بھیگی آنکھوں سے میں نے اپنی کلاس کی ساتھیوں کو دیکھا جو لکھنے میں مصروف تھیں۔ ایک لمحے کے لیے میں نے اُن کی ترس بھری نظریں اپنے اوپر محسوس کیں۔ تب زبردست بے عزتی کے احساس کے ساتھ میں ہال سے باہر آ گئی۔ میں برآمدے سے ہوتے ہوئے پرنسپل کے آفس بھاگی۔ شاید وہ کچھ خیال کریں اور مجھے امتحان میں بیٹھنے کی اجازت خصوصی طور پر دے دیں۔ مِس بیکر شریف اور پیار کرنے والی تھیں۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ ڈسپلن کی بہت سخت تھیں۔ پھر بھی، میں نے سوچا، کوشش کرنے میں کیا حرج ہے، ہال سپروائزر مِس بیکر کی حکم عدولی نہیں کریں گے، اگر انھوں نے مجھے اندر جانے کی اجازت دے دی۔ پرنسپل کا آفس بند تھا۔ میں نے دروازے پر دستک دی۔ کوئی جواب نہیں ملا۔ چپراسی باہر آیا۔

''مِس بیکر کہاں ہیں؟'' میں نے دریافت کیا۔

''وہ ایک میٹنگ میں چلی گئی ہیں'' اُس نے جواب دیا۔

'' میں دل ہی دل میں بڑبڑائی۔ میرا دل ڈوبنے لگا اور میرا گلا خشک ہو گیا۔ میں نے تھوک نگلا اور کسی طرح بولی ''وہ کب واپس آئیں گی؟''

''اسکول ختم ہونے سے پہلے نہیں''۔

بھاری قدموں سے میں برآمدے سے ہوتے ہوئے کار کی طرف گئی۔ میں نے اپنا سلیکشن ٹیسٹ گنوادیا تھا! اگلے دن سے اسکول سردیوں کی چھٹیوں کے لیے بند ہو رہا تھا۔ جس دن یہ کھلے گا، امتحانوں کے نتیجے نوٹس بورڈ پر لگے ہوں گے۔ صرف میرا نام ہی وہاں نہیں ہوگا اور میرے بورڈ کے امتحان اس مرتبہ نہیں ہوں گے! اس خیال نے مجھے چیر کر رکھ دیا۔

ایک سال گنوانا! میری گیلی آنکھوں میں باہر کی طرف بنا لیمپ پوسٹ اور سواریاں دھندلانے لگیں۔

جیسے ہی میں اسپتال کے برآمدے میں داخل ہوئی امّاں میری طرف لپکیں۔ ''اتنی جلدی، وِنی؟''

انھوں نے چکراتے ہوئے پوچھا۔

''انھوں نے مجھے امتحان میں بیٹھنے کی اجازت نہیں دی۔ میں لیٹ تھی''۔ میں نے مختصر اً روداد بیان کی اور اُن سے لپٹ گئی۔ ''امّاں، میرا ایک سال ضائع ہو گیا ہے''۔ میں پھوٹ پڑی۔

"نہیں، نہیں، ونّی"، مجھے ماما کی آواز سنائی دی۔ انھوں نے میرا سر سہلایا۔ مت روؤ، تم اس طرح ایک سال ضائع نہیں کر سکتیں"۔

"آپ کو نہیں معلوم ماما، مِس بیکر کتنی سخت ہیں۔ صرف اُن کو ہی بورڈ کے امتحان میں بیٹھنے دیا جائے گا جو سلیکشن ٹیسٹ پاس کرلیں گے"، میں سُبکتے ہوئے بولی۔

"سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ اب اپنے آنسو پونچھو، سالگرہ والی لڑکی"، انھوں نے مجھے دلاسہ دیا۔ اُن کے الفاظ سے مجھے اطمینان ہوا۔ اماں نے میرے آنسو پونچھے۔

اس کے کچھ ہی دن بعد ماما اور مامی ہمارے ساتھ رہنے کے لیے آگئے اور ہم نے اُن کی دیکھ بھال کرتے ہوئے چھٹیاں بتائیں۔ بورڈ کے امتحان میں نہ بیٹھنے کا خیال اکثر میرے اندر مایوسی کا غلبہ کر دیتا۔ جب بھی میں نے اپنا خدشہ ظاہر کیا۔ ماما نے یہ کہہ کر مجھے خاموش کر دیا "فکر مت کرو، سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا"۔ غیر یقینی صورتِ حال میری مایوسی میں اضافہ کر دیتی تھی۔

چھٹیوں کے بعد جب میں اسکول پہنچی۔ میں نے طلبا کی ایک بھیڑ نوٹس بورڈ کے سامنے دیکھی ۔ وہ میری کلاس کی ساتھی تھیں۔ یقیناً کامیاب ہونے والی طالبات کی فہرست بورڈ پر لگادی گئی ہوگی۔ ایک مرتبہ پھر مایوسی نے مجھے گھیر لیا۔ لسٹ سے میرا نام غائب ہوگا اور میرے قدم دھیرے دھیرے ہوگئے۔

اوہ، وِنّی، مبارک ہو" میری طرف ہاتھ ہلاتے ہوئے ریتو چلائی۔

میں نے تعجب سے منہ اٹھا کر دیکھا۔ ہاں، یہ بات تو ریتو نے میرے لیے کہی تھی۔ کس بات کی مبارک باد؟ مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں ہو رہا تھا۔

میں دوڑی اور راستہ بناتی ہوئی نوٹس بورڈ تک پہنچ گئی۔ ہاں، میرا نام کامیاب امیدواروں میں تھا! میں پاس ہوگئی تھی۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ ردِ عمل ظاہر کرتی مجھے اپنے کندھے پر تھپکی محسوس ہوئی۔ مِس بیکر!

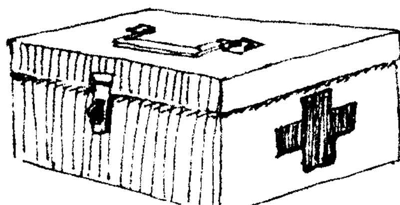
"مبارک ہو، وِنّی" وہ بولیں۔ "لیکن ....." میں ہچکچائی۔

"ہاں، میری بچی، یہ سچ ہے! کلاس میں تمھاری اوسط سب سے اچھی تھی'۔ ہم تمھیں بورڈ کے امتحان میں شریک ہونے سے نہیں روک سکتے تھے۔ خاص طور پر جب کہ تم نے اصل زندگی کا امتحان پاس کر لیا تھا، مِس بیکر ایک سانس میں کہہ گئیں۔

میں نے دوبارہ سوالیہ انداز سے اوپر دیکھا۔ اس سے پہلے کہ پوچھنے کے لیے منہ کھولتی، مِس بیکر مسکرائیں اور سنبھالتے ہوئے بولیں ''اگلے دن تمھارے ماما میرے پاس آئے اور مجھے ساری تفصیل بتائی۔''

پھر مِس بیکر نے تالی بجائی اور میری کلاس کی سب ساتھیوں کو خاموش کیا۔ انھوں نے مختصر طور پر انھیں بتایا کہ کس طرح میں ایک سال ضائع ہونے کے خطرے کو مول لیتے ہوئے مامی کو اسپتال لے گئی۔ جب وہ سانس لینے کے لیے رُکیں تو میری سہیلیوں نے تعریفی نظروں سے مجھے دیکھا۔ مِس بیکر نے مجھے اور قریب کرلیا اور اعلان کیا ''دِنّی کو ''اس سال کی بہادر'' کا ایوارڈ دیا گیا ہے، جو اسکول کو اُس بچے کو دیا جاتا ہے جو مثالی ہمّت دکھاتا ہے۔ مجھے تمھارے اوپر فخر ہے میری بچّی'' انھوں نے مجھے چمٹالیا۔

اچھا، تو یہ وجہ تھی کہ جب کبھی میں اپنی بے چینی کا اظہار کرتی ماما کے چہرے پر شریر مسکراہٹ ہوتی تھی۔ اب مجھے پتہ چلا۔ پچھلے پندرہ دنوں کی تمام کوفت خوشی کے اُس لمحے میں غائب ہوگئی تھی جب کہ میں اپنی سہیلیوں کی مبارک بادیوں کا جواب دے رہی تھی۔



رامائن جو غلط ہو گئی

بہار کے اُس چھوٹے سے خواب آلودہ قصبہ میں ہمارا اکیلا اسکول تھا اور یقیناً بورڈنگ ہاؤس والا بھی اکیلا ہی تھا۔ ایک سو کے لگ بھگ دن کے دن آنے والے بچے تھے جب کہ مزید ایک درجن لڑکے اور لڑکیاں بھی ہاسٹل میں رہتی تھیں۔ حقیقت میں یہ میں تھی جس نے درجن کی تعداد پوری کی تھی۔ یہ ایک ایسی حقیقت تھی جس نے جلدی ہی مجھے دوسروں کے لیے قابل قبول بنادیا تھا ورنہ اتنی جلدی میں اُن میں گھل مل نہ سکتی تھی۔ ہم تقریباً آٹھ سال کی عمروں کے تھے۔ سوائے روما کے جو تیرہ سال کی تھی اور سارے گروپ پر حکم چلاتی تھی۔

یہ روما تھی جس نے فیصلہ کیا تھا کہ ہفتہ میں تین دن ہم لڑکوں کے ساتھ فٹبال کھیلا کریں گی اور اگلے تین دن وہ ہمارے ساتھ گڑیاں کھیلا کریں گے۔ اگرچہ لڑکے ظاہر کرتے تھے کہ وہ بور ہورہے ہیں جب کہ اندرونی طور پر انھیں ہماری گڑیوں کے گھر بنانے، ہمارے پکانے کے لیے پتیاں اور پھول لانے میں مزہ آتا تھا۔ لڑکیاں (سوائے روما کے جو لمبی تھی) فٹ بال ناپسند کرتی تھیں۔ اتوار میں ننوں میں سے ایک کھیل کے دوران ہمارے ساتھ شامل ہو جاتی تھیں۔ ہم یا تو گیت گایا کرتی تھیں یا اُس وقت ٹہلنے کے لیے جاتی تھیں۔

سب سے زیادہ دل چسپ موقع جس کا شدید انتظار رہتا تھا۔ وہ تھا 'بورڈرس کی دعوت'۔ یہ مٹھائیوں، پکنکوں، ایک بڑی ضیافت اور آخر میں موسیقی و ناچ سے بھرپور ہوتا تھا۔ عام طور پر ہم کچھ نظمیں سناتے اور چند ایکشن گیت گاتے۔ اس مرتبہ روما نے تجویز رکھی کہ ہم سچ مچ کا ڈرامہ کھیلیں گے۔ "میں نے اس بارے میں سب کچھ سوچ لیا ہے"۔ اس نے کہا "ہم رامائن کا ایک سین کریں گے۔ لیکن، ہمیں اس کو راز میں رکھنا ہے۔"

ہم سب نے تعجب سے اُس کی طرف دیکھا۔ یہ کرنے کے لیے بہت حوصلے کی ضرورت تھی۔

جو تقریباً نا ممکن تھا۔ "تم لوگ کیوں ہکا بکا ہو"۔ روما نے تیکھے انداز میں سوال کیا۔ "یہ بہت آسان رہے گا۔ ہم وہ سین کریں گے جس میں راون آتا ہے اور سیتا کو پکڑ کر لے جاتا ہے۔ رام اور لکشمن بعد میں آسکتے ہیں اور تھوڑا بہت روئیں گے۔ اور بس۔ پوری رامائن کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔"

لیکن سب کچھ یاد کرنے کے لیے کیا کافی وقت ہے؟"

میں نے شک ظاہر کرتے ہوئے کہا۔ "دعوت پرسوں ہے"، اس میں یاد کرنے کے لیے کچھ نہیں ہے"۔ روما اپنا ہاتھ بے صبری سے ہلاتے ہوئے بولی۔ ہم خود اپنے ہی ڈائیلاگ بنالیں گے۔ بہر حال مجھے اور راون کو ہی باتیں کرنا ہیں۔ رام اور لکشمن کو صرف چلانا ہے۔ 'سیتا! سیتا! اس میں یاد کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے؟"

"تب کیا تم سیتا بن رہی ہو؟" میں نے اپنے اندر چھا جانے والی مایوسی کو چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا۔

"یقیناً!" روما نے بھرپور لہجے میں کہا۔ "یہ میرا آئیڈیا ہے۔ کیا ایسا نہیں ہے؟"

"ہاں، یقیناً ایسا ہی ہے"۔ میں نے اقرار کیا۔ "دوسرے رول کون کر رہے ہیں؟"

"کارتک راون بن سکتا ہے"۔ روما نے جواب دیا "وہ لڑکوں میں سب سے لمبا ہے اگرچہ وہ مجھ سے چھوٹا ہے۔ لیکن اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں ہے"۔

"کارتِک صرف تمھارے کندھوں تک آتا ہے!" میں نے احتجاج کیا۔ "اور وہ تم سے کہیں زیادہ دُبلا ہے!" وہ تم کو اسٹیج سے نہیں کھینچ سکتا!"

"ہاں، وہ ایسا کر سکتا ہے، کیوں کہ میں اُس کے پیچھے خود سے بھاگوں گی اور اُسے مجھے کھینچنے کی ضرورت بالکل نہیں پڑے گی"۔ روما نے کہا۔

"یہ خوف ناک حد تک غیر قدرتی لگے گا"۔ میں نے ضِد والے انداز میں کہا۔

روما نے مجھے کھا جانے والی نظروں سے گھورا"۔ یہ ڈرامہ میرا یا تمھارا؟" اُس نے چبھتی ہوئی آواز میں سوال کیا۔

"تمھارا"۔ میں نے فوراً جواب دیا۔

"تب پھر اس کا انتظام میرے اوپر چھوڑ دو۔"

"رام کون بنے گا؟" سات سالہ بردبار پشپا نے سوال کیا۔

"اور لکشمن؟" چندرا نے، جو اُس کی ہم عمر تھی، پوچھا۔

"نریش اور پچن"۔ روما نے جواب دیا۔

"لیکن نریش اور پچن دونوں کارتک سے چھوٹے ہیں"، میں نے کہا "تمھارا شوہر ایسا نہیں ہو سکتا جو تمھاری کہنیوں تک آتا ہو! یہ بے ہودہ لگے گا!"

"تمھارے ساتھ کیا مصیبت ہے؟" روما نے پوچھا۔

اُس کی آنکھیں پھڑک رہی تھیں۔ "تم بے وقوفانہ اعتراضات کرتے جا رہی ہو! کیا تم بھول گئی ہو، رام اور لکشمن اسٹیج پر اُس وقت آئیں گے جب میں اور راون وہاں سے جا چکے ہوں گے؟ کوئی اِس بات پر دھیان نہیں دے گا کہ وہ لمبے ہیں یا چھوٹے!"

"روبی رام کیوں نہیں بن سکتی؟" چندرا نے کہا، "کم از کم وہ نریش سے تو لمبی ہے۔"

"ایک لڑکی کے لیے رام کا رول کرنا جب کہ یہاں بہت سے لڑکے ہیں، بے وقوفی لگے گی۔" روما زوردار آواز میں بولی۔ "اب خدا کے لیے اپنی زبانیں بند رکھو اور ہمیں ریہرسل کرنے دو۔ وہاں اس طرح مت کھڑی رہو جیسے آندھی و طوفان میں مرتی ہوئی بطخ! دھیان رکھنا تمھیں پردہ کھینچنا ہے، اس لیے اپنی آنکھیں کھلی رکھنا اور خوابوں کی دنیا میں مت چلی جانا!" میں انکار میں کچھ کہنا چاہتی تھی کہ روما نے کچھ اس انداز سے گھورا کہ میں نے تھوک نگلا اور اقرار میں سر ہلا دیا۔

جلدی ہی ہم ڈرامہ میں اتنے منہمک ہو گئے کہ اس بات کی پرواہ نہیں رہی کہ کون سا رول کون کر رہا ہے۔

ریہرسل ٹھیک ٹھاک چلتی رہی البتہ ہر مرتبہ سیتا اور رام والے مکالمے بدل جاتے۔ اس بات نے ڈرامے کو اور بھی دل چسپ بنا دیا۔

"تم کیا پہنو گی، روما؟" پشپا نے دریافت کیا۔ روما کوئی جواب دے نہ سکی۔

روما نے اک لمحے کے لیے تیوریاں چڑھائیں پھر فوراً ہی خوش ہو گئی "یہ بالکل آسان ہے"، وہ بولی "میں اپنی فراک کے اوپر اپنا بیڈ کور لپیٹ لوں گی"۔



"لیکن لڑکے کیا کریں گے!" چندرا نے سوال کیا۔ "تم سب ہی بیڈ کور نہیں پہن سکتے!"

روما نے پھر تیوریاں چڑھائیں "لڑکے اپنے نیکروں کے چاروں طرف اپنے تولیے لپیٹ لیں گے"۔

جب ہم نے اعلان کیا کہ ہم ایک ڈرامہ کرنے جارہے ہیں تو ہماری "بوڈرز کی مسٹریس' سسٹر ڈیورے، بہت خوش دکھائی دیں۔ اور اسی طرح عزت مآب مدر، اور باقی تماش بین بھی۔ فادر ڈونال، بستی کے پادری اور کچھ قریب میں رہنے والے خاندان بھی یہاں تھے۔

ہمارے پاس پہلے ہی ایک اسٹیج اور پردے تھے۔ جلدی ہی ہم گیت اور ایکشن گیتوں میں ماہر ہو گئے تھے۔ ہمارا ڈرامہ شروع ہونے والا تھا۔ میں نے پردہ ہٹایا۔

سیتا ایک نیچے اسٹول پر بیٹھی، اپنے گھٹنوں پر بسکٹ کی ایک پلیٹ کا توازن بنا رہی تھی۔ اُس نے فرش پر بیٹھنے سے انکار کر دیا تھا۔ کیوں کہ اُسے ڈر تھا کہ کہیں بیڈ کور کھل نہ جائے۔ راون داخل ہوا اُس نے جامنی نیلے رنگ کا تولیہ پہنا ہوا تھا اور ہری روشنائی سے جلدی میں بنائی ہوئی مونچھیں تھیں کیوں کہ کالی روشنائی وہاں نہیں تھی۔ سب نے شور مچایا۔ راون اپنے ڈائلاگ بھول گیا

"جاؤ، سیتا کو آواز دو" میں نے تحریک دی۔

"باہر آؤ، سیتا" راون پہاڑا پڑھنے والے انداز میں بولا

"پہلے کچھ کھانے کے لیے مانگو" سیتا نے اپنا چہرہ دوسری طرف پھیرتے ہوئے دھیمے سے کہا۔

"مجھے دو ...... مجھے دو ...... بسکٹ کی وہ پلیٹ دو"؟ راون نے گھبراہٹ میں ہکلاتے ہوئے کہا۔

"میں تمھیں کچھ نہیں دوں گی۔ تم بھاگ جاؤ" سیتا غصے سے بولی۔ "میں ...... میں تمھارے بال نوچ لوں گا۔ اگر تم نہیں دوگی" راون ایک ہاتھ سے تولیہ سنبھالتے ہوئے اور دوسرا سیتا کی پلیٹ کی طرف بڑھاتے ہوئے باغیانہ انداز میں بولا۔ تماش بین زور زور سے چیخے۔

سیتا نے راون کے گال پر ایک زوردار طمانچہ جڑ دیا۔ راون اس غیر متوقع برتاؤ پر چکرا گیا، اسٹول سے ٹکرایا اور دھم سے نیچے گر پڑا اور زور زور سے رونے لگا۔ "سیسی" سیتا نے اُسے منہ چڑاتے ہوئے کہا" بچہ روؤ!"

رام جو حقیقی زندگی میں راون کا بھائی تھا۔ اسٹیج پر "بھیا" چلاتا ہوا دوڑا اور راون کے گرد اپنی بانہہ ڈال کر رونے لگا۔ لکشمن بھی خاموشی سے اندر آگیا اور بسکٹ کی پلیٹ ہتھیالی۔ تماشائی اب جوش سے دیوانے ہو گئے تھے۔ سیتا شاہانہ انداز میں کھڑی ہوئی، روتے ہوئے رام اور راون کو ایک دوسرے سے کھینچ کر الگ کیا اور انھیں سختی سے اسٹیج سے باہر لے گئی۔ "اب میں تمھارے ساتھ دوبارہ کبھی ڈرامہ نہیں کھیلوں گی روتے بچو!" وہ غصہ سے بڑبڑائی۔ "تم خود کو لڑکے کہتے ہو! چھی! حتی کہ چندرا اور پشپا تم سے بہتر کر لیتیں!"

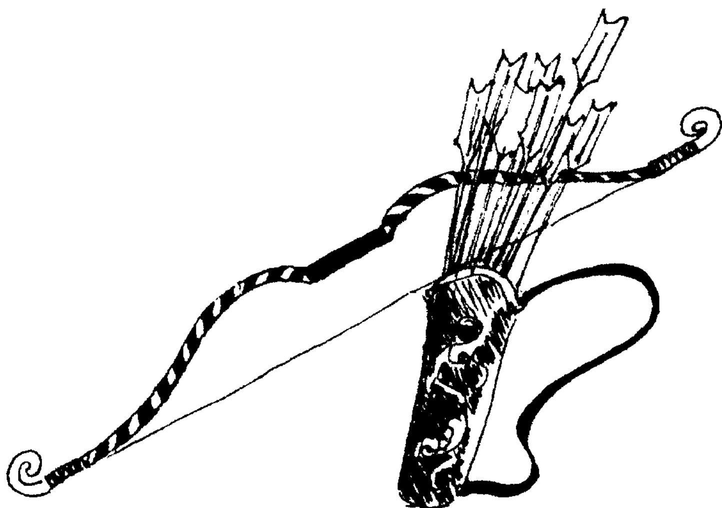
تماشائیوں نے ہمارے اوپر تالیاں بجائیں

"میں نے اپنی زندگی میں کبھی اتنی دل چسپ چیز نہیں دیکھی!" فادر ڈونال نے ہنستے ہوئے کہا

"لیکن ہم اس کو اتنا الم ناک بنانا چاہتے تھے کہ آپ سب کی آنکھوں میں آنسو آجاتے!" روما نے حقارت سے کہا۔

"ٹھیک ہے، تم شان دار طریقے سے کامیاب ہو گئی ہو!"

عزت مآب مدر نے اپنی آنکھیں پونچھتے ہوئے رائے زنی کی۔



کنواں، کنواں

میں جلدی سے پنڈال سے باہر آئی، جہاں کیرتن ہو رہا تھا۔ ممّی اور ماسی اپنی آنکھیں بند کیے بھجن گا رہی تھیں۔ ممّی نے کہا تھا اگر میں جانا چاہتی ہوں تو جا سکتی ہوں لیکن انھیں ڈسٹرب نہ کروں۔

جیسے ہی میں دروازے سے باہر آئی۔ میں نے دوڑنا شروع کر دیا اتنا تیز جتنا کہ میری ٹانگیں میرا ساتھ دے سکتی تھیں۔ میرے گھٹنے دُکھنے لگے تھے اور میرا دل بہت تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ ''کیا گڈو، چوکیدار کالڑ کا وقت پر یہاں پہنچ جائے گا؟ فرض کرو میں مر جاؤں یا اس سے بھی بُرا ہو، کہ گڈو۔۔'' بہتر ہے کہ میں اس کے بارے میں نہ سوچوں۔ میں نے اپنا ذہن بنالیا تھا اور گڈو تیار ہو گیا تھا۔ ہمیں اُسے بچانا تھا۔ ہمیں اُسے بچانا تھا۔

جیسے ہی میں امرود کے باغ کے کونے پر مڑی'' مجھے گڈو نظر آیا، جو اپنی گردن انسپیکشن بنگلے، جس میں ہم ٹھہرے ہوئے تھے کی طرف اُٹھا رکھی تھی۔

''گڈو'' میں ہانپ رہی تھی، ''کیا سب کچھ تیار ہے؟''

''ہم وقت سے پہلے آگئے ہیں، وبجو بے بی''، اُس نے جواب دیا۔

''تمھیں یاد ہے وہ کہہ رہے تھے کہ بارہ بجے کے آس پاس جب سب پرساد لینے میں لگے ہوں گے، وہ یہاں آئیں گے''۔ ابھی بہت وقت ہے، میں نے رسّی اور بالٹی لے لی ہے۔ آؤ، وہاں جلدی پہنچیں''۔

''ہاں'' میں نے کہا'' لیکن''، میں پھر راستہ میں رُک گئی۔

''لیکن گڈو، تم مجھ سے چھوٹے ہو اور میں تمھیں یہ خطرہ مول نہیں لینے دوں گی۔ تم مجھے

نیچے اتارنا اور پھر تم آم کے پیڑ پر چھپ جانا اگر کچھ گڑ بڑ ہو گئی تو تم مدد کرنے کے لیے وہاں ہو گے۔ تم دوسروں سے یہاں تک کہنے کی کوشش کر سکتے ہو کہ میں تہہ میں ہوں۔ ہو سکتا ہے وہ اپنے ظالمانہ مذاق سے باز آجائیں"۔

"دیکھو"۔ گنڈو فخر سے بولا، میں بھلے ہی تم سے چھوٹا ہوں، لیکن میں ساری عمر جبشیور نگر میں رہا ہوں۔ جہاں تک میرا تعلق ہے میرے لیے کنویں سے پانی نکالنا پانی حاصل کرنے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے۔ کنووں کی مرمت کے لیے اُن کی گہرائی میں جانا، لوگوں کو بچانا، ایسی باتیں ہیں، جو میں نے جب سیکھ لی تھیں جب میں نے چلنا شروع کیا تھا۔ اس کے علاوہ ہم لوگوں کی کوئی اور زندگی نہیں۔ تمھارے لیے یہ خطرناک ہے۔ مجھے معلوم ہے جبل پور میں تمھارے گھر میں دو کنویں ہیں۔ لیکن تمھیں اُس میں سے پانی نکالنا نہیں ہوتا"۔ اُس نے مجھے دکھانے کے لیے اپنے دونوں ہاتھ پھیلائے۔ "کیا کبھی تم کنویں کی تہہ میں گئی ہو؟ نہیں! اس لیے تم آم کے پیڑ پر چڑھو گی اور میں نیچے اُتروں گا"۔

"نہیں، گنڈو، نہیں"، مجھے اپنی آنکھوں میں آنسو چبھتے ہوئے محسوس ہوئے، لیکن میں نے طے کر رکھا تھا کہ روؤں گی نہیں، کیوں کہ مجھے یقین تھا کہ صرف میں ہی بچاؤ کا یہ کام کر سکتی ہوں۔ "نہیں گنڈو، یہ خیال میرا تھا اور میں اس کو نہیں بدلوں گی، چاہے میں مر جاؤں"۔

"بہت اچھا، آؤ اب چلیں، گنڈو بولا اور ہم آگے بڑھ گئے۔ میں دبے قدموں سے اُس سے چند قدم پیچھے چل رہی تھی۔ میں نہیں جانتی کہ میں کس چیز سے زیادہ ڈر رہی تھی۔ آیا اُس کام سے جو ہم کرنے جا رہے تھے یا اس بات سے کہ بڑے کیا کہیں گے جب انھیں معلوم ہوگا۔ لیکن اُس وقت میں صرف کنویں کی گہری، اندھیری تہہ، جس میں، میں اور گنڈو چھپنے جا رہے تھے اور اُس کے اسباب کے بارے میں ہی سوچ سکتی تھی۔

میں واقعی دیدی کو نہیں سمجھ سکتی۔ میں نے سوچا۔ وہ میری اچھی اور پیاری دیدی سے بالکل عجیب اور مختلف ہو گئی تھیں ...... اور حتی کہ میرے وہ چچا زاد بھائی بھی جو اکیلے ہوتے تھے تو بہت اچھے ہوتے تھے۔ لیکن سب مل کر وہ بہت بدمعاش ہو جاتے تھے۔ حتی کہ دیدی بھی اُن کے ساتھ مل کر خونخوار ہو جاتی تھیں۔

اُس رات دوبارہ، جب ہم اپنے کیمپ کی چارپائیوں پر انسپیکشن بنگلے کے لان میں ستاروں کے نیچے لیٹے تھے۔ میں نے دیدی کو قائل کرنے کی کوشش کی تھی لیکن بے سود۔

"دیکھو"، انھوں نے اپنی بڑے پن کی آواز میں کہا

"تم نہیں سمجھیں، کیوں کہ تم ابھی چھوٹی ہو، اور ابھی بہت چھوٹی کلاس میں ہو۔ وِشو، نندو اور میں جو کرنے جا رہے ہیں وہ ایک سائنسی تجربہ ہے۔ انھوں نے "سائنسی تجربہ" پر زور دیا جیسے کہ میں اُس کو نہیں سمجھ سکوں گی۔

"ہاں" میں نے صبر سے کہا "لیکن دیدی، چوزہ مر سکتا ہے، وہ مر جائے گا اور آپ کس طرح جان بوجھ کر ایسا خطرہ مول لے سکتی ہیں؟"

"بے بی"، ضرورت سے زیادہ اسمارٹ وشو دادا نے اپنی چڑانے والی، بڑے بھائی کی آواز میں بیچ میں دخل دیا۔ "بے بی؟ تمھارے پاس سائنسی دماغ نہیں ہے"۔

"مجھے اس کی ضرورت بھی نہیں ہے، اگر جو کچھ تم کر رہے وہ کسی کو مارنے کے لیے ہو......" میں نے ٹکر ماری لیکن وہ کہتا رہا"، دیکھو بچی" بائیو لیب میں وہ ہمیں زندہ مینڈک دیتے ہیں۔ لیب اسسٹنٹ انھیں کلوروفارم سنگھاتا ہے۔ ہم اُن بے ہوش مینڈکوں کو ٹرے سے چپکانے کے لیے پن لگاتے ہیں۔ پھر ہم قینچیاں اور چمٹیاں لیتے ہیں اور انھیں کاٹ کر کھول دیتے ہیں۔ ہماری بائیولوجی کی ٹیچر مینڈکوں کے جسم کی ساخت کے بارے میں بتاتی ہیں اور جب کلاس ختم ہو جاتی ہے ہم ان مینڈکوں کو زندہ کرنے کے لیے سیتے نہیں ہیں۔ لیب اسسٹنٹ انھیں کوڑے دان میں پھینک دیتا ہے۔ ہم اپنے ہاتھ دھوتے ہیں اور اپنی اگلی کلاس میں چلے جاتے ہیں۔ ہم خود کو قصوروار محسوس نہیں کرتے۔ کیوں کہ یہ ہماری تعلیم کا حصہ ہوتا ہے۔ اگر ہم اُداس ہونے لگیں اور احتجاج کریں تو ہم کوئی چیز کیسے سیکھ سکیں گے؟"

"ہاں، دادا"، میں اپنی نہایت فرماں برداری والی زبان میں بولی"۔

"لیکن برائے مہربانی دادا" میں نے وکالت کی "ایک چھوٹے سے چوزے کو کنویں میں پھینک کر اور یہ دیکھ کر آیا وہ اُڑ کر باہر آسکتا ہے، تم کون سا سائنسی نظریہ قائم کر لو گے؟ وہ مر جائے گا، دادا، مجھے معلوم ہے وہ مر جائے گا"۔ میں اب رونے لگی تھی۔

"بے وقوف!" نندو بولا۔ "دسنتی یہ تمھاری غلطی ہے کہ تم نے اس چھوٹی سی بہن کو ہمارے منصوبوں کے بارے میں بتایا۔ اب وہ اس جگہ کو آنسوؤں میں ڈبو دے گی، اب یہ بک بک کرے گی اور ہمارا تجربہ خاک میں مل جائے گا"۔

"وہ کسی سے نہیں کہے گی"، دیدی آہستہ سے بولیں"، وہ میری بہن ہے اور میں جانتی ہوں وہ اپنے وعدے کی پوری ہے۔ تم کسی سے تو نہیں کہو گی، وبجو، کیا تم کہو گی؟" دیدی نے مچھردانی سے اپنا سر باہر نکالا اور مجھ سے پوچھا۔

" نہیں "میں سسکیاں لینے لگی "لیکن تم سب نیچ لوگ ہو۔ بھگوان تمھیں سزا دے گا"۔

"ہاں،ہاں، بڑی آئی سادھو! ہم گنہگار ہیں، تم کل کیرتن میں جانااور ہمارے لیے دعا کرنا، جب ہم اپنا سائنسی تجربہ کر رہے ہوں گے"۔وِشوداابولے۔

دیدی نے مجھے دلاسہ دینے کی کوشش کی"، کچھ نہیں ہوگا! دیکھو، ہم جانتے ہیں کہ ہم کیا کر رہے ہیں۔ آخر کو ہم نے کچھ سائنس سیکھنی ہے اور جب ہمارا تجربہ پورا ہو جائے گا میں شانتی سے کہوں گی کہ وہ چوزہ تم کو دے دے۔ مجھے یقین ہے ڈیڈی تمھیں اسے واپس جبل پور لے جانے دیں گے۔ پھر جب وہ بڑا ہو جائے گا تم اُس کے انڈے کھا سکتی ہو"۔

"نہیں"، میں نے سرکشی سے کہا۔"وہ مر جائے گا، کیا آپ کو معلوم نہیں ہے کہ کنواں گہرا اور تاریک ہے۔وہ کس طرح زندہ رہے گا اگر وہ اوپر سے تہہ میں گرے گا؟"

دیدی نے ہار مان لی اور سو گئیں۔ میں نے اپنا منصوبہ بنالیا۔ میں بہت جلد اُٹھ جاتی تھی اور گڈو بھی۔ وہ مجھ سے ایک سال چھوٹا تھا لیکن جب ہم اپنی سالانہ گرمی کی چھٹیاں گزارنے آتے تھے۔ وہ بہت سے چھوٹے موٹے کام انسپیکشن بنگلے میں کرتا تھا۔ وہ میرا اچھا دوست تھا اور جب میں نے اُسے بتایا کہ میری بہن اور بھائی کتنے ظالم ہوگئے ہیں اور شانتی کے ایک چوزے پر ایک سائنسی تجربہ کرنے جارہے ہیں، وہ مدد کرنے کے لیے تیار ہو گیا۔

شانتی نوکروں کے کوارٹرز میں رہتی تھی۔ اُس نے مرغیاں پالی ہوئی تھیں اور ان کے انڈے انسپیکشن بنگلہ میں سپلائی کرتی تھی۔ اس کے روئیں دار چھوٹے چوزے دو ماہ کے تھے اور انھوں نے ابھی مرغیوں جیسا دِکھنا شروع کیا تھا۔ اُن کے پر بڑے اور مضبوط ہوتے جارہے تھے۔ ہم بچوں کو آنگن میں اُن کا پیچھا کرنا، اُن کا بچنے کے لیے پھڑ پھڑا کر بھاگنا بہت اچھا لگتا تھا۔ یہی وہ وقت تھا جب دیدی اور ننددو کو اپنا شاندار سائنسی خیال سوجھا۔

شانتی، عام طور پر کبھی اپنی مرغیاں یا ان کے بچے نہیں گنتی تھی۔ جب بھی کبھی اُس کا کوئی چھوٹا چوزا کھو جاتا وہ یقین کر لیتی کہ جب وہ دور نکل گیا ہوگا کوئی بھیڑیا اُسے کھا گیا ہوگا۔

میں یہ باتیں سوچنے میں اتنی منہمک ہوگئی کہ اُس اہم قدم کے بارے میں بھول گئی جو ہم اُٹھانے جارہے تھے۔ مجھے پھر ڈر لگا، لیکن میں نے آگے بڑھنے کا تہیہ کیا ہوا تھا۔ گڈو نے میرے احساسات کا اندازہ لگالیا، وہ بولا، "بے بی، میں وعدہ کرتا ہوں، میں ٹھیک وہی کروں گا جو تم کرو گی۔ مہربانی کر کے مجھے اکیلا نیچے جانے دو۔

"نہیں"، میں چیخی، مجھے نیچے جانے دو، اس سے پہلے کہ وہ لوگ یہاں آ جائیں۔

"بہت اچھا، اس نے لمبی موٹی رسّی جو وہ لایا تھا بالٹی سے باندھ دی۔ پھر اُس نے پرانی رسّی جو پہلے ہی چرخی پر تھی اتاری اور بالٹی کے ساتھ نئی اُس پر ڈال دی۔ اُس کو مضبوطی سے پکڑ کر اُس نے مجھ سے بالٹی میں بیٹھ جانے کے لیے کہا۔

میرے ہونٹوں پر دعا تھی اور میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ میرے کان سرخ ہو گئے تھے۔ میں بالٹی کے اندر بیٹھ گئی۔ گنڈو نے اُسے نیچے کی طرف دھکیل دیا اس طرح کہ بیچوں بیچ لٹک گئی اور بہت کوششوں سے اُس نے آہستہ آہستہ نیچے کیا...... میں نے اپنی آنکھیں سختی سے بند کر لیں اور جب میں نے رگڑ کی آواز سنی اور محسوس کیا کہ بالٹی کنویں کی تہہ میں ٹھہر گئی ہے تو میں نے دیکھنے کی ہمت کی۔ وہ بالکل خشک تھا بالٹی سے باہر آتے ہوئے میں نے اوپر کی طرف دیکھا۔ گنڈو کا سر ایک چھوٹے سے دھبے کی طرح نظر آ رہا تھا وہ یہ جاننے کے لیے جھانک رہا تھا کہ کیا میں ٹھیک ٹھاک ہوں۔ جب میں نے رسّی ہلائی اُس نے بالٹی کو اوپر کھینچنا شروع کر دیا۔

میں نے کنویں میں چاروں طرف دیکھا، ایسی جگہ تلاش کرنے کے لیے کہ جہاں میں چھپ سکوں تاکہ جب وہ عظیم سائنسداں آئیں تو مجھے نہ دیکھ پائیں اور چوزے کو پھینک کر چلے جائیں، جیسا کہ انھوں نے منصوبہ بنایا تھا۔

تب گنڈو آئے گا، بالٹی نیچے کرے گا، میں اُس میں سوار ہو جاؤں گی اور بچائے گئے چوزے کے ساتھ اوپر کھینچ لی جاؤں گی۔

وہاں بہت چھڑیاں اور پتھر چاروں طرف پڑے ہوئے تھے۔ وہ سب کچھ تھا جو ہم نے گونج کی آواز سننے کے لیے اس میں پھینکا تھا۔ میں نے سہارے کے لیے ایک لکڑی اُٹھانے کا فیصلہ کیا، گو کہ میں گنڈو کو واقعی بہادر ظاہر کر رہی تھی، اُس گہرے اندھیرے کنویں میں ڈر لگ رہا تھا۔ میں ایک مڑی ہوئی لمبی مضبوط دِکھنے والی لکڑی کو اٹھانے کے لیے جھکی۔ لیکن جیسے ہی میں نے اُس کو چھوا۔ میں خوف سے چیخ پڑی۔ میری آواز گونجتی رہی، گونجتی رہی۔ وہ ایک سانپ تھا! ڈر کر وہ دور کھسک گیا۔ تبھی ایک چیرتی ہوئی آواز اور ایک زوردار دھماکہ میرے پیچھے سنائی دیا اور وہاں بالٹی میں چوٹ کھایا زخمی گنڈو تھا جو باہر نکلنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"ارے، تم کیوں نیچے آ گئے گنڈو؟ اب ہمیں کون اوپر کھینچے گا، بے وقوف؟ کسی کو نہیں معلوم کہ ہم یہاں ہیں"۔

"مجھے یہ اچھا لگا تھا!" اُس نے جھنجھلا کر کہا ہماری آوازیں گونج رہی تھیں۔ پہلے تو تم چیخیں جیسے کہ تمھیں قتل کر دیا گیا ہو، اور اب مجھ سے پوچھتی ہو کہ میں مدد کے لیے نیچے کیوں آیا"۔

"لیکن اب ہم کس طرح واپس جائیں گے گڈو؟" میں پریشان ہوئی۔

"میں صاحب اور میم صاحبہ کو کیا جواب دوں گا، اگر تمھیں کچھ ہو گیا؟ خاموش رہو، انھیں چوزہ نیچے پھینکنے دو تب ہم غل مچائیں گے"۔

"اب کیوں کہ تم بھی یہاں ہو میں اب خوف زدہ بلی کی طرح نہیں ہوں"۔

میری ہندسوں والی گھڑی کے مطابق باتیں کرتے ہم نے تقریباً پندرہ منٹ گزار دیے ہوں گے کہ ہم نے نندو، دیدی اور رِشو داداکی جوش بھری آوازیں سُنیں۔

پھر پروں کی پھڑپھڑاہٹ سنائی دی۔ فلیپ، فلیپ اور ایک زور کی، کوک، کوک، لیکن کوئی چوزہ نیچے گرتا پڑتا نہیں آیا۔

"بے وقوف چڑیا"، میں نے نندو کو کہتے ہوئے سنا "تمھیں کنویں کی تہہ تک جانا ہے۔ پھر اُڑ کر باہر آنا ہے۔ او بے وقوف!"

"اس میں چوزے کا کوئی قصور نہیں ہے، نٹ۔ کنویں میں لٹکانے سے پہلے تمھیں اس کے بازو مضبوطی سے پکڑ لینے چاہیے تھیں"۔ دیدی بولیں۔

میں نے اپنے اعصاب مضبوط کیے، میرا گلا خشک ہوتا جارہا تھا۔ حتیٰ کہ گڈو جو میرے برابر کھڑا ہوا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ اکڑ گیا ہو۔

کوک، کوک، نے ہمیں ہوشیار کر دیا اور ہمارے سروں پر بے چارہ چوزہ میرے اور گڈو کے بیچ آکر گرا۔

میں نے چوزے کو اُٹھا لیا۔ میں نے دیکھا کہ اُسے کوئی چوٹ نہیں آئی تھی۔ میں نے اپنے سینے کے قریب اُسے اپنی فراک سے چپٹا لیا۔ وہ وہاں لیٹا ہوا ہانپ رہا تھا، اُس کو سانس بمشکل آرہا تھا...... اور وہ خاموش تھا۔

اب میں نے اور گڈو نے غل مچانا شروع کیا...... "ارے دیدی! نندو...... دو...... دو" بازگشت ہماری آوازوں سے زیادہ زور کی محسوس ہوئی۔ "مدد...... د...... د......" "دی دی...... ی...... ی...... مدد......"



میں نے نندو کے چلانے کی آواز سنی "اے کنویں میں بھوت ہیں۔وہ خوف زدہ لگ رہا تھا۔

"نہیں،اے بے وقوف یہ وبجو اور گُڈو کی آوازیں ہیں۔

دیدی چلائیں۔انھوں نے آوازیں دینا شروع کیں۔"وبجو،وبجو،گُڈو!کیا تم دونوں وہاں ہو'

جواب دو۔تم اندر کیسے پہنچے؟"

"اب ہمیں یقیناً سزا ملے گی" ہو شوداوار وتے ہوئے بولا۔

"اور میں سب سے بڑا ہوں۔تم ہمیشہ ہم کو کیوں مصیبت میں ڈالتی ہو،وبجو؟ جلدی کرو،
تیزی سے باہر آؤ......"

"بھیا"گُڈو نے جواب دیا،"ہمارے پاس یہاں ایک لمبی رسّی اور بالٹی ہے۔اگر آپ پرانی والی
رسی نیچے لٹکادیں تو ہم اس سے اپنی نئی والی باندھ دیں گے اور آپ ہمیں ایک ایک کر کے اوپر
کھینچ سکتے ہیں۔

"ٹھیک ہے"۔ تین اُداس آوازوں نے کہا۔

"دیدی نے ہم سے زور کی آواز میں پوچھا،"چوزہ کہاں ہے؟"

"یہ میرے پاس ہے دیدی۔ آپ کا سائنسی تجربہ ناکام ہو گیا ہے"، میں نے چلا کر جواب دیا۔

"ہمیں معلوم ہے۔ ہمیں معلوم ہے۔ ہمیں افسوس ہے ...... " تینوں آوازیں دوبارہ
بڑبڑائیں۔

"نندو جاؤ اور راموچاچا،یعنی گُڈو کے ابا کو بلالاؤ۔وہ......"میں نے وِشوداداکو کہتے ہوئے سنا۔

"نہیں، نہیں،ابّا کو مت بلانا،نندو بھیا ،وہ مجھے ماریں گے۔ ساجد چاچا کو بلالو۔ یہ بڑے اور
مضبوط بھی ہیں اور وہ ہماری باتیں راز میں بھی رکھیں گے۔ گُڈو گڑگڑایا۔

دیدی اور وِشودادانے ٹوٹی چھوٹی رسّی نیچے لٹکائی اور گُڈو کے ماہر ہاتھوں نے نئی رسّی کو اُس
سے باندھ دیا۔

گُڈو نے زبردستی مجھے پہلے بالٹی میں بٹھایا،"کیا ہو گا اگر سانپ باہر آگیا،"اُس نے چڑاتے
ہوئے آہستہ سے کہا۔

"ہا،ہا"۔ میں نے مذاق میں کہا، "چھوٹا چوزہ اس کو مار دے گا"۔

"اب"۔ وہ بولا۔

میں بالٹی میں بیٹھ گئی اور تھوڑی ہی دیر میں ہوا میں اوپر تھی۔ چوزے کو یہ سواری اور اس کے جھٹکے پسند نہیں آئے اور زور سے آواز نکالی اور میری فراک سے اپنا سر باہر نکال لیا۔ میں نے اُسے سختی سے پکڑے رکھا۔ بہر حال میں چندھیانے والی روشنی میں پہنچ گئی تھی اور ہاتھوں کے تین بے چین جوڑوں نے بالٹی کو پکڑ لیا اور مجھے باہر نکالا۔ میں اُن کی پیار بھری بانہوں میں گر گئی۔ چوزہ میرے ہاتھوں سے اُڑ گیا۔ گڈو کو بھی باہر نکال لیا گیا۔ میں سب کچھ بھول گئی اور اُس کو چمٹا لیا اور دیدی، نندو اور روشو دادا نے بھی ایسا ہی کیا۔
ماجد چاچا اپنے ساتھ پانی کا ایک جگ لے آئے تھے۔ میں نے اور گڈو دونوں نے بے صبری سے پانی پیا۔ اب تمام خوف اور احساس جرم جاتا رہا تھا اور دیدی نندو اور روشو دادا کتنے اچھے تھے اور حقیقتاً افسوس کر رہے تھے۔
بعد میں شام کو جب سب لوگ گھر پر تھے اور نانی پرساد بانٹ رہی تھیں۔ ہم نے اپنے خطرناک کارنامے کا ماجرا بیان کیا اور معافی مانگی اور ماجد چاچا سے کہلوایا کہ کوئی گڑبڑ والی بات نہیں ہوئی تھی۔ خالو جان اور ابا نے ہمیں چھوٹا سا لیکچر دیا اور کہا "انت بھلا تو سب بھلا۔ لیکن ہوشیار رہا کرو"۔
اور نانی بولیں "لیکن میری اچھی سی چھوٹی بٹیا کو انعام ملنا چاہیے"۔ وہ مہم جو چھوٹا سا چوزہ شانتی کے گھر سے لایا گیا اور مجھے تحفے میں دیا گیا۔ میں نے اُسے گڈو کو تحفتاً دے دیا۔ "میرے لیے اس کی دیکھ بھال کرتے رہنا"۔ میں نے کہا۔
گڈو مسکرایا اور اُسے قبول کر لیا۔

کرکٹ میچ

''اور اب آنند راؤنڈ دی وکٹ بال کر رہے ہیں اور اشوک نے اُسے شاندار چھکّے کے لیے اٹھا دیا ہے۔ اس عمدہ چھکّے کے ساتھ، راجہ الیون نے سیمی فائنل جیت لیا ہے۔ اگلے ہفتہ اُن کا مقابلہ پچھلے سال کی چیمپئن 'نواب الیون' کے ساتھ ساوان میں ساوان اسکول کرکٹ ٹورنامنٹس کے فائنل کے لیے ہوگا۔ اور اب کچھ دل چسپ آنکڑے '' کمنٹریٹر نے اپنی کمنٹری جاری رکھی۔

لیکن کسی کو بھی اس طرح کے اعداد و شمار سے جو کمنٹریٹر دے رہا تھا دل چسپی نہیں تھی۔ میزبان ٹیم جیت چکی تھی۔ فضا خوشیوں سے معمور تھی۔ فیکٹری کے چیئرمین مسٹر پردھان جیتنے والوں کو مبارک باد دینے کے لیے آئے۔ ''لڑکو، تم لوگوں نے بہت اچھا کھیلا، یہ پہلی مرتبہ ہے کہ ہماری ٹیم فائنل میں پہنچی ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ تم ٹرافی کو جیتنے کے ارادے سے کھیلو گے۔ ساوان کا گراؤنڈ تمھارے لیے تیار ہے''۔ مسٹر پردھان نے کہا۔

ساوان قریب ہی واقع کیمکل فیکٹری کا شہر ہے۔ ساوان اسکول کرکٹ ٹورنامنٹ ہر سال فیکٹری کی طرف سے منعقد کیا جاتا ہے۔ راجا XI کی یہ پہلی جیت قابل خوشی واقعہ تھا۔ سب لوگ ٹاؤن شپ کی بس میں سوار ہو گئے اور تمام راستے خوب گانا بجانا اور ناچ ہوتا رہا۔

اشوک، راجا ٹیم کا کھلاڑی اور کپتان اور اُس کے دوست آخری لائن میں بیٹھے تھے۔ وہ میچ کا زبردست پوسٹ مارٹم کرنے میں لگے ہوئے تھے۔

''میں سمجھتا ہوں نواب XI اب ایک بہت اچھی ٹیم ہے''۔ اور اُن کو ٹریننگ دینے کے لیے ایک پیشہ ور کوچ ہے''۔ اشوک بولا۔



"جب تک کہ تم اس طرح کے خوب صورت اسٹروک مارتے رہو گے جیسا کہ تم نے پچھلے میچ میں مارے ہیں، ہمیں فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے"۔ راہل چلایا۔

"ہم گزری ہوئی باتوں کے بارے میں بات نہ کریں بلکہ ہم کل سے سخت پریکٹس کریں۔ ہم میں سے سب ساڑھے تین بجے گراؤنڈ پہنچ جائیں۔ سب کے لیے ٹھیک ہے نا؟" اشوک نے پوچھا۔ "ہاں ہاں" سب نے ایک آواز میں کہا۔

اگلے دن ٹھیک ساڑھے تین بجے لڑکے پریکٹس کے لیے تیار تھے۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ لیکن سردیوں کے نرم سورج نے اُس کو ایک خوشگوار سہ پہر بنادیا تھا۔

ایک ایک کرکے ہر لڑکے نے بیٹنگ کی۔ اب سنیل کی بیٹنگ کرنے کی باری تھی۔ اُس نے ابھی چند گیندیں ہی کھیلی تھیں کہ وہ پیشانی صاف کرنے کے لیے سیدھا کھڑا ہوا۔

"گھوش! گرمی ہے اور میں نے سوچا تھا ابھی سردیاں ہیں"۔ سنیل بُدبُدایا۔

"یہاں گرمی ہے، شاید وہ ہمارے لیے اس جگہ کو گرم کر رہے ہیں"۔ راہل نے مذاق کیا۔

"بے وقوف بنانا بند کرو لڑکو"۔ اشوک نے حکم دیا۔

"اگر تم دونوں کو وقفہ چاہیے تو جاؤ"۔ مجھے بیٹنگ کرنے دو"۔ اُس نے آگے کہا۔

جلدی ہی وہ بھی بے چینی محسوس کرنے لگا اور بیٹ اور بال کی ملاقات نہیں کراپا رہا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں جلن ہونے لگی تھی۔

"نہیں آج میرا دن نہیں ہے۔ میں سوچتا ہوں۔ مجھے آج کے لیے بس کرنا چاہیے"۔ اشوک نے سانس کھینچتے ہوئے کہا۔

"دیکھو اشوک، فیکٹری کی چمنی کے اُس دُھویں کو دیکھو"، راہل چیخا۔

"یہ بات ہے۔ اسی وجہ سے ہم لوگ بے چینی محسوس کر رہے تھے"۔ راجو کھانستے ہوئے بولا۔

اُس وقت تک اشوک کی آنکھیں لال ہو گئیں تھیں اور ان سے پانی بہنے لگا تھا۔ راجو کی کھانسی تیز ہوتی جا رہی تھی۔

راہل اور سنیل بے چین کر دینے والی گرمی محسوس کر رہے تھے۔

اُن کی ٹیم کے ساتھی بھی بے چین تھے۔ سرمئی رنگ کا کالا دھواں آہستہ آہستہ نیلے آسمان پر اِدھر سے اُدھر پھیل رہا تھا۔ سردیوں کی خوب صورت دوپہر برباد ہو گئی تھی۔

گھر پہنچ کر اشوک نے اپنی آنکھیں دھوئیں اور بہتر محسوس کرنے لگا۔ لیکن جلدی ہی چبھن پھر شروع ہو گئی۔ رات کے کھانے پر اشوک کی ماں نے اس کی لال آنکھیں دیکھیں۔

"کیا تمھارے چوٹ لگی ہے۔ اشوک؟" اُس کی ماں نے پوچھا۔

"نہیں ماں، لیکن کچھ بے چینی ہے"۔ اشوک نے کہا۔

"کل ہم ڈاکٹر کو دکھا سکتے ہیں"۔

اگلی صبح اشوک اور اُس کی ماں پالی کلینک گئے۔ جب وہ آنکھوں کے ڈاکٹر کو دکھانے کے لیے اپنی باری کا انتظار کر رہے تھے۔ راجو بھی کھانستا ہوا پہنچا۔ وہ بھی اپنی ماں کے ساتھ تھا۔

"اس مرتبہ راجو کی کھانسی بہت سخت ہے۔ مجھے امید ہے ڈاکٹر اُس کو مستقل ٹھیک کرنے کے لیے دوا دے سکے گا۔ احمد آباد میں اُس کو یہ شکایت نہیں تھی"۔ اُس کی ماں بولی۔ وہ پریشان نظر آ رہی تھی۔

اشوک کی ماں نے اس سے ہمدردی ظاہر کی اور اُس کو اشوک کی تکلیف کے بارے میں بتایا۔

تبھی اشوک اور اُس کی ماں کو اندر بلا لیا گیا۔ عام چیک اپ سے پتہ چلا کہ اشوک کو چشمے کی ضرورت نہیں۔ لیکن اُس کی آنکھوں کو دیکھ کر ڈاکٹر بہت زیادہ مطمئن نہیں تھا۔

کچھ اور ٹیسٹ کرنے کے بعد اُس نے اشوک کی ماں سے کہا "اچھا، مسز جین، میں محسوس کرتا ہوں کہ اشوک کی آنکھوں میں سخت الرجی ہے۔ یہ ٹھیک ہوا کہ آپ جلدی ہی آ گئیں۔ مناسب علاج سے وہ ٹھیک ہو جائے گا۔ میرا خیال ہے کہ ہوا کو صاف رکھنے کے لیے کچھ کیا جانا چاہیے۔ اس طرح کے معاملات بڑھ رہے ہیں"۔ ڈاکٹر بوس نے احتجاجاً کہا۔ پھر وہ اشوک سے مخاطب ہوئے، "اور، اشوک، کم از کم علاج کے دوران باہر زیادہ نکلنے سے پرہیز کرو"۔

"یہ ناممکن ہے، ڈاکٹر صاحب۔ میں اپنی ٹیم کی کپتانی کر رہا ہوں اور فائنل میں صرف ایک ہفتہ اور رہ گیا ہے۔ میں کس طرح گھر پر رُک سکتا ہوں؟" اشوک نے دلیل دی۔

اگر وہ چھوٹا بچہ ہوتا وہ رونے لگتا۔ اُس کی ماں حیرانی میں تھی۔ اس میچ کو جیتنے کا مطلب تھا کہ اشوک کو ریاستی ٹیم میں جگہ مل سکتی تھی اور جس کے لیے اشوک پچھلے سال سے سخت محنت کر رہا تھا۔ لیکن اُس کی آنکھیں بھی بہت قیمتی تھیں۔ اُس نے التجا بھری نظروں سے ڈاکٹر کو دیکھا۔

'مجھے افسوس ہے، بیٹے، تمھیں گھر پر ہی رہنا ہوگا کم از کم اُس وقت تک جب تک کہ تم زیرِ علاج ہو۔ اگر تم نے اب دھیان نہیں رکھا تو تمھاری آنکھیں ہمیشہ کے لیے خراب ہو جائیں گی"۔ ڈاکٹر نے وارننگ دی۔

اشوک کو محسوس ہوا جیسے تمام دنیا اُس کے چاروں طرف بکھر گئی ہے۔ اُس کا سر نیچے جھک گیا۔ وہ ڈاکٹر کے کلینک سے باہر چلا گیا۔

اُس شام جب لڑکے اسے پریکٹس کے لیے بلانے کے لیے آئے تو اُس نے انھیں ڈاکٹر کے یہاں اپنے جانے کے بارے میں بتایا۔ لڑکے چکرا گئے۔

"لیکن اشوک تم ٹیم کے کپتان ہو۔ تمھارے بغیر ہم کیسے کھیل سکتے ہیں؟" راہل روہانسا ہو کر بولا۔

"ہو سکتا ہے چند دنوں میں میں بالکل ٹھیک ہو جاؤں۔ تب میں تمھارے ساتھ شامل ہو جاؤں گا۔ لیکن تم سب پریکٹس جاری رکھو"۔

لڑکے اُداس ہو گئے۔ لیکن انھوں نے پریکٹس کرنے کا فیصلہ کیا پھر وہ راجو کے گھر گئے۔ وہاں بھی اُن کا استقبال بیمار راجو نے کیا۔ آلودگی نے اُسے بھی متاثر کیا تھا۔

بہترین کھلاڑی بیمار پڑے تھے۔ یہ بات بہت بری تھی۔ لڑکے میدان میں گئے لیکن کسی کا دھیان کھیل میں نہیں تھا۔ جب وہ میدان میں تھے۔ فیکٹری سے ایک مرتبہ پھر دھواں نکلا جس نے کھلاڑیوں کو متاثر کیا۔

وہ سب اشوک کے گھر واپس گئے اور اُسے میدان میں اوپر اُڑنے والے گہرے دھویں کے بارے میں بتایا۔ زیادہ تر کھلاڑی کھانس رہے تھے۔ اشوک غمگین ہو گیا۔

"مجھے حقیقتاً بہت بُرا محسوس ہو رہا ہے۔ خاص طور سے جب ہم اتنے آگے تک پہنچ گئے تھے اور وہ بھی پہلی مرتبہ"۔ اشوک نے آہ بھری۔

"لیکن یہ دھواں ہمارے لیے پریکٹس کرنا بھی دو بھر کرے دے رہا ہے"۔ سنیل غصہ میں تھا۔

"ہمیں دھویں کے لیے کچھ کرنا چاہیے، نہیں تو ہم میچ نہیں کھیل سکتے"۔

"صبح اپنے پرنسپل سے ملیں"۔ آخر کو اسکول کی عزت بھی داؤ پر ہے۔ میں تمھارے ساتھ جاؤں گا"۔ اشوک نے مشورہ دیا۔

اگلے دن وہ پرنسپل کے آفس گئے۔ اشوک بھی اپنی آنکھوں کی حفاظت کے لیے کالا چشمہ پہنے ان کے ساتھ تھا۔

وہاں بہت زیادہ جوشیلے انداز میں باتیں ہوئیں اور پرنسپل نے انھیں توجہ سے سنا۔

"سر! میچ خطرے میں ہونے کے علاوہ، مخالف ٹیم ہمارے بارے میں کیا سوچے گی؟" وہ کیسے کھیلیں گے کیوں کہ وہ بھی آلودگی سے متاثر ہو سکتے ہیں"۔ اشوک بولا۔

"ہاں یہ ایک سنجیدہ مسئلہ ہے۔ میرا خیال ہے کہ تم سب جاؤ اور مسٹر پردھان کے سامنے آلودگی کا یہ مسئلہ رکھو"۔ پرنسپل نے رائے دی۔

اب تک یہ خبر چاروں طرف پھیل گئی تھی کہ اشوک اور راجو آلودگی کے سبب بیمار ہیں۔ اسی طرح کے دوسرے معاملے بھی زیرِ بحث تھے۔

اشوک اور اس کی ٹیم کے چند ساتھیوں کو تمام بچوں کی طرف سے بولنا تھا۔ وہ سب مسٹر پردھان سے ملنے فیکٹری گئے۔ اشوک اور اُس کے ساتھیوں کو دیکھ کر مسٹر پردھان ان کے استقبال کرنے کے لیے آگے آئے۔

"مجھے امید ہے میدان اچھی حالت میں ہوگا اور تم سخت پریکٹس کر رہے ہوگے"۔ وہ بولے۔

"اگر چہ ہم سخت پریکٹس کرنا چاہتے ہیں لیکن ہم ایسا نہیں کر پا رہے ہیں"۔ اشوک نے کہا۔

"جناب فیکٹری کا دھواں ہم سب کو متاثر کر رہا ہے"۔

سنیل نے بات آگے بڑھائی۔

مسٹر پردھان نے پچھلے دنوں کی تفصیلات معلوم کیں۔ وہ بہت زیادہ فکر مند ہوئے۔ وہ کچھ دقفے کے بعد بولے۔

"ہمارے پاس ہوا صاف کرنے اور کالونی کے چاروں طرف پیڑ لگانے کے منصوبے ہیں۔ لیکن کسی وجہ سے وہ ملتوی ہوگئے۔ میرا خیال ہے میں اب اس معاملے پر زور دوں گا"۔

"لیکن جناب یہ اقدامات طویل مدتی ہیں۔ ہفتہ کو ہونے والے میچ کا کیا ہوگا؟" سنیل نے دریافت کیا۔

"جناب اگر میں مشورہ دوں۔ کیا آپ فیکٹری کو میچ والے دن اور میچ سے ایک دن پہلے بند کر سکتے ہو؟" اشوک نے جھجکتے ہوئے رائے دی۔

کچھ لمحوں کے غور کے بعد مسٹر پردھان راضی ہو گئے۔

"آخر کو ساوان بھی داؤ پر ہے"۔ وہ بولے

کھلاڑی خوش ہو گئے۔ اپنی روزانہ کی پریکٹس کے لیے انھوں نے کالونی سے بہت دور ایک کھلے میدان کا استعمال کیا۔

فائنل کا دن آ پہنچا "بھرپور سردیوں کا ٹھنڈا دن"۔ کیوں کہ فیکٹری بند تھی اس لیے تماشائیوں کی گیلری کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ میدان کے ایک کنارے پر رکھی ٹرافی سورج میں چمک رہی تھی۔

دونوں ٹیمیں اپنی اپنی سفید پوشاکوں میں میدان میں آئیں۔ نواب کی ٹیم اعتماد سے پُر تھی۔ راجہ کی ٹیم ڈری ہوئی لیکن پُر امید تھی۔ مسٹر پردھان نے سکہ اُچھالا اور نواب کی ٹیم بیٹنگ کرنے گئی۔

میچ زوردار رہا۔ دونوں ٹیموں نے برابر کا مقابلہ کیا۔ راجو اور اشوک کی کامیاب ساجھے داری نے اپنی ٹیم کے لیے ٹرافی جیت لی۔ جب وہ پویلین کی طرف بھاگے انھوں نے اوپر کی طرف دیکھا انھیں آلودگی سے صاف اور خوب صورت نیلا آسمان دکھائی دیا۔



آخری پرچہ

"لو ہمارے امتحان آج ختم ہو جائیں گے۔" میں نے گوپال سے کہا۔ "اور ہم آزاد ہو جائیں گے۔"

گوپال بھی امتحان ختم ہونے کے بارے میں اتنا ہی بے قرار تھا۔ وہ بولا "ہاں" "کل ہم آزاد ہوں گے اور پہلی چیز جو ہم کریں گے وہ یہ ہے کہ ہم پہاڑی کی طرف آم کے باغوں میں جائیں گے اور آم کھائیں گے۔"

"ہاں، ہم صبح سویرے ہی چل پڑیں گے۔"

آخری پرچہ سہ پہر کی شفٹ میں تھا۔ اس دن بہت گرمی تھی اور ہم سر سے پاؤں تک پسینے میں نہا رہے تھے۔

چوراہے پر سر دھر بھی ہمارے ساتھ ہو لیا۔ ہم اپنے اسکول پیدل ہی روانہ ہو گئے۔ جلد ہی اسکول کی نمایاں دیواریں ایک فاصلے پر نظر آنے لگیں۔ ہم تیز تیز چلے۔

اسکول میں ہم نے ہر کسی کو نہایت عجلت میں آخری تیاریاں کرتے ہوئے دیکھا۔ کچھ کھیل کے میدان میں بیٹھے ہوئے تھے۔ کچھ پیڑوں کے سہارے کھڑے تھے۔ اُن کی آنکھیں، اپنی کاپیوں پر جمی تھیں۔ ہمارا آخری پرچہ 'تاریخ انگلستان' تھا۔

سر دھر جو تاریخ سے خوف زدہ تھا، گھبرا رہا تھا۔ جب ہم اسکول پہنچے اس نے مجھ سے پوچھا۔ "سوالوں کے بارے میں کوئی اندازہ؟ کیا وہ مشکل ہوں گے؟"

"ہمارے تاریخ کے ٹیچر کرشن چلتے غالباً دیوانے ہیں اس لیے کسی بھی سوال کی توقع کی جا سکتی ہے۔"

گھنٹی بجی ہم اپنی کتابوں کو امتحان ہال کے اندر چبوترے پر چھوڑتے ہوئے اپنی اپنی نشستوں کی طرف لپکے۔

جوابات لکھنے کے لیے کاپیاں پہلے ہی سے ہمارے ڈیسکوں پر موجود تھیں۔ میں نے اپنا رول نمبر کاپی سے لگی شیٹ پر لکھااور مضمون کا نام "تاریخ انگلستان" لکھا۔

جیسے ہی دوسری گھنٹی بجی کاغذ پھڑ پھڑانے لگے۔ سوالات کے پرچے تقسیم کر دیے گئے۔ جیسے ہی میں نے سوالوں پر ایک نظر ڈالی خوشی کی ایک لہر میرے اندر دوڑ گئی۔ سوالات بہت آسان اور متوقع تھے۔

مزید اعتماد حاصل کرنے کے لیے میں نے اپنا ہاتھ اٹھایا اور پانی مانگا۔ اسکول کا چپراسی رمن نائر مٹکے سے ٹھنڈے پانی کا گلاس لایا۔ پانی پینے کے بعد میں نے لکھنا شروع کر دیا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ میں اتنا تیز لکھ سکتا ہوں۔

جوابات مکمل کرنے کے بعد میں نے گھنٹے کی طرف دیکھا۔ چار بج کر بیس منٹ ہوئے تھے اور پیپر پانچ بجے تک چلنا تھا! پیپر تین کے بجائے ڈھائی گھنٹے کا کیوں نہیں رکھا گیا! میں نے بے چینی سے باہر برآمدے کی طرف دیکھا۔ کاش میں ہمت جٹا پاتا اور پیپر جمع کر کے باہر چلا جاتا۔

تبھی مجھے ہمارے ماسٹر کرشن پلے نظر پڑے۔ میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ اُن کی آنکھیں میرے اوپر تھیں۔ میں نے ظاہر کیا جیسے کہ میں سوالات حل کرنے میں لگا ہوں۔ میں نے دوبارہ سے جوابات پر نظر ڈالنا چاہی۔ میں نے پہلے سوال کے اپنے جواب کی چند لائنوں پر نظر ڈالی تھی کہ میں بور ہو گیا۔ صفحہ پلٹتے ہوئے اور ایسا ظاہر کرتے ہوئے جیسے کہ نظر ثانی کر رہا ہوں میں آخری جواب کو گھورنے لگا۔

کرشن پلے جا چکے تھے۔ میں نے امید کرتے ہوئے کہ پانچ بج چکے ہوں گے گھنٹے کی طرف دیکھا۔ ابھی تک صرف ساڑھے چار بجے تھے!

میں یہ دیکھنے کے لیے پیچھے مڑا کہ دوسرے کیا کر رہے ہیں۔ گوپال متواتر لکھ رہا تھا اور دنیا و مافیہا سے تقریباً بے خبر تھا۔ سر دھر بھی منہ سے زبان باہر نکالے لکھ رہا تھا اور اپنے پین کی نوک سے اُس کو ادھر اُدھر ہلا رہا تھا۔ راجو، اپنے پین سے اپنی ٹھوڑی کھجاتے ہوئے چھت کو گھور رہا تھا، شاید مزید خیالات حاصل کرنا چاہتا تھا۔ ہری اپنی کرسی پر پیچھے کی طرف جھکا ہوا تھا۔ نگراں کمرے میں ادھر سے ادھر ٹہل رہے تھے سپروائزر کرسی پر بیٹھے سو رہے تھے۔

میں نے پھرتی سے اپنی کاپی لی۔ نگراں کے حوالے کیا اور باہر آ گیا۔ میں نے سوالات کے پرچے کو تہہ کر کے اپنی جیب میں رکھ لیا۔ برآمدے میں کھڑے ہو کر میں اپنے دوستوں کے باہر آنے کا انتظار کرنے لگا۔

میرے پاس گرمیوں کی چھٹیاں گزارنے کے لیے بہت سارے منصوبے تھے۔ مدراس میں میرے چچا نے چند روز اپنے ساتھ گزارنے کے لیے بلایا تھا۔

مرینا بیچ پر شام کے وقت آزادانہ گھومتے ہوئے، سمندر کی ٹھنڈی ہوا کا لطف اُٹھانے میں کتنا مزہ آئے گا! مدراس میں بہت اچھی لائبریریاں اور کھانے کی جگہیں ہیں اور اچھے سنیما گھر بھی جن میں جدید ترین انگلش فلمیں دکھائی جاتی ہیں۔ پھر اپنی پھوپھی کے یہاں شمالی کیرل میں، جنھوں نے مجھے اپنے دیہات کے گھر میں بلایا تھا۔ میں اپنے امتحان کے آخری دن کے بارے میں بے قرار تھا اور وہ دن آگیا تھا!

ایک گھنٹی بجی۔ " آدھا گھنٹہ اور "ایک نگراں نے اپنی کرخت آواز میں اعلان کیا۔ اس وقت میں نے ہال کے ایک سرے پر سے سپروائزر کی آواز سنی۔ "ایک اعلان کیا جاتا ہے۔ برائے مہربانی سنیے! آپ کو معلوم ہے کہ تاریخ کے پرچے میں آٹھ سوال ہیں۔ پانچ پہلے صفحے پر اور تین دوسرے صفحے پر۔ آپ کو صرف پانچ کے جواب لکھنا ہیں۔ یہ ہدایت سوالات کے پرچے کی چھپائی کے وقت غلطی سے چھوٹ گئی تھی"۔

کیا! آٹھ سوال! میں نے اپنا سوال کا پرچہ باہر نکالا اور اُس کے صفحہ دو کو دیکھا۔ ایک ٹھنڈی لہر میری ریڑھ کی ہڈی میں سے ہو کر گزر گئی۔ تین سوال میری نظر سے چوک گئے تھے! اس اعلان کے لیے خدا کا شکر ہے!

میں گھر بھاگا۔ میں نے اپنی ماں کو بے صبری سے اپنا انتظار کرتے ہوئے گیٹ پر پایا۔ "تمھارا آخری پرچہ کیسا ہوا؟"

میں نے انھیں پرچہ دکھایا اور پوری بات کہہ سنائی۔ جب میں یہ سب بتا رہا تھا۔ ماں کے چہرے پر بے چینی، خوف، سکون اور آخر میں شکر اور خوشی کے جذبات دیکھ سکتا تھا۔ "بھگوان نے تمھیں بچا لیا"۔ انھوں نے کہا

"اس مرتبہ جب تم کیرل جاؤ تو گوروؤیور مندر جانا نہ بھولنا۔ اُس نے تمھیں بچا لیا ہے۔ صرف اُسی نے اور کسی نے نہیں!"



ماں نے چائے کے ساتھ کچھ مزے دار ناشتہ تیار کیا تھا جس وقت میں ناشتہ کر رہا تھا ابّا اندر آئے۔ وہ اپنے عام طور کے خوش گوار موڈ میں تھے۔ انھوں نے میری پیٹھ تھپتھپاتے ہوئے کہا" تو اب تم ایک آزاد پرندہ ہو، اپنے مدراس کے ٹور کے بارے میں منصوبے بنا رہے ہو، میں سمجھتا ہوں؟

مجھے معلوم ہے وہ توجہ کی خاص جگہ ہے۔ اُس کے بعد نیلمبور اور اپنے دادا کے وطن تریچور جہاں تمھارے کھانے کے لیے ڈھیر سارے جیک پھل ہوں گے اور تم موٹے ہو جاؤ گے!"

وہ پھر ہنسنے لگے۔ انھوں نے اپنی آنکھوں میں ایک چمک کے ساتھ ماں پر نظر ڈالی۔ "خیر سے تم نے اپنا انگلستان کی تاریخ کا پرچہ کیسا کیا؟"

"بس ٹھیک ہو گیا"۔ میں نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

"کیوں، صرف ٹھیک ہی کیوں؟ لاؤ میں پرچہ دیکھوں؟"

میں نے پرچہ انھیں دے دیا۔ انھوں نے اُسے غور سے پڑھا۔ "مجھے امید ہے تم نے سارے سوالات کے جواب اچھی طرح دیے ہوں گے؟"

"نہیں، ابّا، میں نے صرف پانچ کے جواب لکھے ہیں؟"

"کیوں؟ باقی کا کیا ہوا؟ سوال نمبر چھ، سات اور آٹھ؟"

"میں نے اُنھیں نہیں دیکھا"۔

ابّا کی آواز ایک دم بدل گئی۔

"دیکھا اپنا کارنامہ! میں جانتا تھا تم اس طرح کی بھیانک غلطیاں کرو گے۔ تم ہمیشہ جلدی میں رہتے ہو اور غائب دماغ رہتے ہو!"

"لیکن ابّا جان...... بعد میں ایک تصحیح کرائی گئی تھی۔ ہمیں صرف پانچ سوالوں کے جواب دینا تھا"۔

وہ خوش نہیں تھے۔ "تم اپنی گرمیوں کی چھٹیوں کے بارے میں سوچ رہے تھے۔ تم جلد سے جلد امتحان سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتے تھے۔ لیکن اس طرح کی خوش قسمتی کی توقع ہر مرتبہ مت رکھنا۔ بہتر ہے کہ ہوشیار رہو"۔

"اب تم جاؤ، نہاؤ، اچھی طرح کھاؤ، گہری نیند سوؤ اور جیک فروٹ اور فلموں کے خواب دیکھو!"

مالیو چڑیا

نکوبار جزائر کا سب سے چھوٹا جزیرہ سب سے بڑے جزیرے سے زیادہ دور نہیں تھا۔ دونوں کے درمیان ہر شام کشتی چلتی تھی۔ جاوید بڑے جزیرے پر رہتا تھا۔ اُس کے والد ساحل پر گارڈ تھے۔ جاوید چھوٹے جزیرے پر جانا چاہتا تھا، لیکن اُس کے والد اُسے اجازت نہیں دیتے تھے۔ جب کبھی جاوید پوچھتا، وہ ہمیشہ کہتے، "تم ایک چھوٹی جگہ جا کر کیا کرو گے جہاں صرف مٹھی بھر قدیم لوگ آباد ہیں؟"

جاوید مایوس ہو جاتا، لیکن اُس کا تجسس بڑھتا جاتا تھا۔ جاوید جاننا چاہتا تھا کہ جزیرے والے کیسے رہتے ہیں۔ مچھلیاں پکڑنا اُن کا خاص پیشہ تھا۔ وہ کشتی سے مچھلیاں بڑے جزیرے بھیج دیتے اور وہاں سے بدلے میں اپنی ضرورت کی چیزیں حاصل کر لیتے۔ جاوید نے اپنے باپ کو دِق کر دیا کہ وہ اُسے وہاں جانے کی اجازت دے دیں۔

آخر کار جاوید کی گیارھویں سال گرہ پر اُس کے والد راضی ہو گئے۔ جاوید بہت خوش تھا۔

جب چھوٹے جزیرے سے کشتی پہنچی جاوید جلدی سے اُس میں سوار ہو گیا۔ ملاح، جو اُس کے خاندان کا دوست تھا، جاوید کو جزیرے لے جانے میں خوش تھا۔

سورج چھپ چکا تھا جب کشتی جزیرے پر پہنچی۔ گرم ہوا چل رہی تھی۔ کشتی والے کے لڑکے 'تومو' نے خوشی سے جاوید کا استقبال کیا اور اُسے گھر لے گیا۔ وہ تقریباً اتنا ہی بڑا تھا جتنا کہ جاوید۔

مدھم، لال ٹین گھر کے اندھیرے کو دور کر رہی تھی۔ جاوید نے چاول اور مچھلی کا عمدہ کھانا کھایا اور ناریل اور کیلے کی میٹھی کھیر بھی۔

کھانا کھانے کے بعد جلدی ہی سونے کا وقت ہو گیا۔ جزیرے کے لوگوں کے پاس اندھیرے میں کوئی اور کام کرنے کے لیے نہیں ہوتا۔ لیکن جاوید اتنی جلدی سونے کا عادی نہیں تھا۔ وہ بہت دیر تک جاگتا رہا۔ یہاں تک کہ نیند نے اُسے اپنی آغوش میں لے لیا۔

صبح کو ٹوموجاوید کو جزیرہ گھمانے لے گیا۔ وہاں ناریل کے چند درخت تھے۔ جنگلی جھاڑیاں، جن میں رس دار ارغوانی بیر اور کیلوں کے پیڑ چاروں طرف اُگے ہوئے تھے۔ ایک طرف ریت کا پشتہ، خشک پتیاں اور جنگل کا حصہ تھا۔

"جنگل کے اندر کیا ہے؟" جاوید نے پوچھا۔

"کچھ جنگلی کتے اور نیولے۔ یہاں بہت سے رنگین مرغ ہوتے تھے لیکن اب بہت کم ہیں"۔ ٹومو نے جواب دیا۔

"کیا وہ مر گئے؟" جاوید نے سوال کیا۔

"مجھے نہیں معلوم؟"

جاوید ٹومو سے بولا، "میں اتنی جلدی نہیں سو سکتا جتنی جلدی کہ تم۔ میں اپنے ساتھ ایک لال ٹین لے کر رات کے کھانے کے بعد ٹہلنے جایا کروں گا"۔

"آ......!" بدروحیں لال ٹین کے چاروں طرف ناچیں گی اور تمھارے اوپر حملہ کر دیں گی"۔ خوف سے بھرپور ٹومو بولا۔

"بے ہودہ بات!" جاوید پلٹ کر بولا، "بدروحوں کا کوئی وجود نہیں ہے"۔

"کچھ بھی ہو، میری ماں تمھیں اجازت نہیں دیں گی"۔ ٹومو نے دلیل پیش کی۔

جاوید نے اُسے آمادہ کیا۔ "میرے ساتھ آؤ۔ ہم جب سو چکے ہوں گے ہم خاموشی سے باہر چلے جائیں گے۔ ہم زیادہ دور نہیں جائیں گے"۔

کچھ ہچکچاہٹ کے بعد ٹوموتیار ہو گیا۔

جب رات ہوئی، جاوید اور ٹومو نے ایک لال ٹین جلائی، سامنے والا دروازہ آہستہ سے کھولا اور باہر کھسک گئے۔ بہت دور ایک کتا بھونکا، ورنہ مکمل خاموشی تھی۔ یہ ایک کھلی ہوئی گرم رات تھی۔ ٹومو کے ہاتھ کی لال ٹین چاروں طرف مدھم سی روشنی پھینک رہی تھی۔

اچانک کوئی چھوٹی اور چمک دار چیز آگے اندھیرے میں چمکی۔ ٹومو رُک گیا۔ اس نے جاوید کو کس کر پکڑ لیا۔ جاوید نے بھی اُس چمک دار چیز کو دیکھا۔ لیکن وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھا اور ہوشیاری سے دیکھتا رہا۔ تھوڑی دیر بعد وہ ہنسا۔

"یہ صرف ایک بھنورا ہے"۔ اُس نے خیال ظاہر کیا۔

"نہیں" ٹومو نے انکار کیا۔ "یہ بدروح ہے"۔ وہ مُڑا اور گھر بھاگ گیا۔ جاوید مکمل اندھیرے میں اکیلا کھڑا رہا۔

کچھ ہی دیر میں چاند نکل آیا۔ جاوید نے آگے بڑھنے اور ٹہلنے کا ارادہ کیا۔ وہ تقریباً جنگل تک پہنچ گیا تھا جب وہ اچانک رُک گیا۔ جاوید دُبک گیا اور غور سے سننے لگا۔ یہ یقیناً قدموں کی چاپ اور سوکھی پتیوں کی کھڑکھڑاہٹ کی آواز تھی۔ جاوید انتظار کرنے لگا۔ لیکن اُسے پھر کچھ سنائی نہ دیا، نہ کچھ نظر آیا۔ اُس نے طے کیا کہ وہ تحقیق کے لیے اگلی رات پھر جائے گا۔

اگلے روز جاوید نے ٹومو کو قدموں کی آواز کے بارے میں بتایا۔ "پھر بدروحیں" ٹومو چیخا۔

"چپ کرو میں آج رات پھر وہاں جارہا ہوں۔ اگر تم ڈر رہے ہو، تمھیں آگے آنے کی ضرورت نہیں ہے"۔ جاوید نے پلٹ کر جواب دیا۔

تجسس نے ٹومو کے خوف پر قابو پالیا۔ اُس نے جاوید کے ساتھ جانے کا فیصلہ کر لیا۔

جب رات آئی تو جاوید اور ٹومو چاند نکلنے کا انتظار کرنے لگے۔ وہ اپنے ساتھ لال ٹین لے کر نہیں گئے تھے۔ لیکن وہ لاٹھیوں کے ساتھ مسلح ہو کر گئے۔ وہ اُس جگہ پہنچ گئے، جہاں پچھلی رات جاوید کھڑا رہا تھا اور انتظار کرنے لگے۔

جلدی ہی انھیں پیروں کی آواز اور پتیوں کی کھڑکھڑاہٹ سنائی دی۔ قدموں کی آواز تیز تھی۔ جاوید اور ٹومو اندھیرے میں گھور رہے تھے۔ ایک شکل تیزی سے ان کے پاس سے گزر گئی۔ ٹومو نے جاوید کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا۔

"آؤ، ہم اُس شکل کا پیچھا کریں" اُس نے کان میں کہا اور خاموشی سے آگے بڑھ گیا۔ چاندنی رات میں ایک آدمی کا ہیولی تیزی سے جاتے ہوئے صاف نظر آرہا تھا۔

"میں جانتا ہوں وہ کہاں جارہا ہے"۔ ٹومو نے اظہار کیا "مچھلی پکڑنے والی کشتیوں کی طرف"۔

"کیا وہاں جانے کا کوئی چھوٹا راستہ ہے جس سے ہم جا سکیں؟"

جاوید نے سرگوشی کی۔ "ہاں" ٹومُو نے راستہ دکھایا۔ دونوں آگے بھاگے۔ جلدی ہی وہ اس ہیولے سے آگے نکل گئے۔ وہ آگے بڑھے اور جھاڑیوں کے پیچھے چھپ گئے۔ انھوں نے سڑک پر لاٹھیاں آرپار پھیلا دیں۔ ہیولے نے ٹھوکر کھائی اور گر پڑا۔ جب وہ اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا جاوید اور ٹومُو باہر نکل آئے اور اس کا مقابلہ کیا۔ لیکن ہیولے نے ایک لاٹھی چھین لی اور اُس کو ہوا میں لہرایا۔ اس سے پہلے کہ وہ بچوں پر وار کرتا وہ واپس بھاگ گئے اور خود کو چھپالیا۔ ہیولے نے چاروں طرف دیکھا۔ سب طرف خاموشی تھی۔ ایک ہاتھ میں لاٹھی لیے وہ دوسری سمت بھاگ گیا اور جلدی ہی وہ غائب ہو گیا۔

"اُس نے اپنا ارادہ بدل دیا ہے۔ وہ مچھلی پکڑنے والی کشتیوں کی طرف نہیں گیا ہے"۔ ٹومُو چاند کی روشنی میں جو کچھ دیکھ سکا اس سے اندازہ لگایا۔ جاوید کو مایوسی ہوئی۔ دونوں تھک گئے تھے۔ انھوں نے معاملے کا پتہ لگانے کے لیے صبح واپس آنے کا فیصلہ کیا اور صرف ایک لاٹھی لیے گھر چلے گئے۔ جیسے ہی وہ بستر میں لیٹے نیند نے اُنھیں گھیر لیا۔

جب جاوید اُٹھا اُس وقت خاصا دن نکل آیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد ہی ٹومُو اور جاوید باہر آئے اور اُسی راستہ پر چلے جو گزشتہ رات انھوں نے استعمال کیا تھا۔

جب وہ ریت اور پتیوں کے ڈھیر کے پاس پہنچے۔ انھوں نے اُس کو تمام کھدا ہوا پایا۔

"کیا اُس ہیولے نے کیا ہے؟ کس لیے؟" ایسے کچھ سوالات جاوید کے ذہن میں اُبھرے۔ لیکن ان کا کوئی جواب نہیں تھا۔

بچے اُس جگہ گئے جہاں وہ ہیولے اٹک کر گرا تھا۔ وہاں انھیں کچھ نہیں ملا۔ آخر میں وہ جھونپڑیوں کی طرف گئے جہاں وہ ہیولے غائب ہوا تھا۔

گاؤں کے مرد مچھلیاں پکڑنے سمندر کی طرف چلے گئے تھے۔ مچھیرنیں مچھلیاں سکھا رہی تھیں۔ کچھ مچھلیاں ٹوکریوں میں پیک رکھی تھیں، جو شام کے ٹرپ سے کشتی سے بڑے جزیرے جانا تھیں۔ بچے گھر لوٹ گئے۔ وہ اپنی تحقیقات سے بہت خوش نہیں تھے سوائے اس کے کہ انھوں نے وہ لاٹھی زمین پر پڑی بر آمد کر لی تھی۔ جاوید اُس لاٹھی کو دور پھینکنے ہی کو تھا کہ ٹومُو چلایا،

"دیکھو! لاٹھی کے سرے پر کیل سے کپڑے کا ایک چھوٹا ٹکڑا اٹکا ہوا ہے۔ وہ شکاری کا ہو سکتا ہے۔ آخر کار، کچھ ثبوت تو ملا!"



جاوید نے اُس کو لے لیا اور احتیاط سے اپنی جیب میں رکھ لیا، ''ہمیں میرے والد کو اُس شکاری ہیولے کے بارے میں ضرور بتانا چاہیے''۔ ٹومو بولا۔

''ہوں''، جاوید سنسنت تھا۔ اُس کو شام کی کشتی سے رخصت ہونا تھا واپس گھر جانا تھا وہ دماغ میں ایک معمہ کے ساتھ گھر جانا اچھا نہیں سمجھ رہا تھا۔

''میں اپنے والد کو اس کے بارے میں بتاؤں گا''، اُس نے آخر میں اعلان کیا۔ ٹومو نے جلدی سے لقمہ دیا۔ ''میں بھی تمھارے ساتھ کشتی میں آرہا ہوں''۔

اُس شام دیر سے کشتی پہنچی۔ دونوں جاوید اور ٹومو کے باپ شکاری کی کہانی سے جو اُن بچوں نے سنائی حیرت زدہ تھے۔ جاوید نے کپڑے کا ٹکڑا اپنی جیب سے نکالا اور انھیں دکھایا۔

''کیا وہاں کوئی چوری یا اسمگلنگ جاری ہے؟'' جاوید کے والد نے سوال کیا۔

بچوں نے ٹومو کے باپ کی طرف اشتیاق سے دیکھا۔

''میں اُس کے بارے میں نہیں جانتا''۔ اس کی طرف سے جواب آیا۔ اس نے بہر حال کپڑے کا معائنہ کیا اور جوش میں بولا ''یہ مچھیروں کے سردار کی پگڑی کا ہے''۔

کچھ چل رہا ہے جو ہمیں معلوم نہیں''۔ جاوید کے والد سنجیدگی سے بولے اور چپ ہو گئے۔ پھر اچانک انھوں نے خیال ظاہر کیا ''آؤ مچھلیاں دیکھیں جو تم لائے ہو''۔

''کس لیے؟'' ٹومو کے باپ نے پوچھا۔

''کیوں کہ میں ایسا حکم دیتا ہوں؟'' جاوید کے والد نے اونچی آواز میں کہا۔ جاوید اور ٹومو نے مچھلیوں کی ٹوکریوں کو کھولنے میں مدد کی۔ وہ سب نو ٹوکریاں تھیں۔ لیکن آخری ٹوکری میں مچھلیاں نہیں تھیں۔ اس کے بجائے اُس میں انڈے تھے۔

''اتنے بڑے انڈے!'' ٹومو چلایا۔ بطخ کے عام انڈوں کے مقابلہ میں یہ تین گنا بڑے تھے۔

''اب تمھارے پاس کیا جواب ہے؟'' جاوید کے والد نے سختی سے پوچھا ''کیا جزیرے پر تم خاص قسم کی مرغیاں پال رہے ہو اور اُن کے انڈے بیچ رہے ہو؟''

''نہیں، نہیں...... ہم نہیں...... میں...... میں نہیں جانتا''۔ ٹومو کا باپ ہکلایا۔

ٹومو نے مجھے بتایا تھا کہ وہاں جزیرے پر پہلے خوب صورت جنگلی مرغیاں تھیں۔ لیکن اب وہ نظر نہیں آتیں"۔

"کیا تم نے نہیں بتایا تھا، ٹومو؟" جاوید نے پوچھا

"ہاں...... ہاں"۔ ٹومو نے اقرار کیا۔

"جو میرے بیٹے نے کہا وہ یقیناً سچ ہے"۔ کشتی بان نے کہا

"جنگلی جانوروں کا غائب ہونا...... انڈے...... چور شکاری...... ہوں!" جاوید کے والد بڑبڑائے۔

"آپ نے کیا کہا، ابّا؟" جاوید نے سوال کیا۔

"کچھ نہیں، حقیقتاً، ابھی نہیں، مجھے ابھی مزید معلومات کرنا ہوں گی"۔ اُس کے والد نے جواب دیا۔ انھوں نے کشتی بان اور اُس کے لڑکے کو یہ کہتے ہوئے جانے دیا۔ "اس بات کو اپنے تک ہی رکھنا، جب تک کہ میں مزید تحقیق نہ کر لوں"۔

جاوید کے اسکول کھل گئے تھے۔ وہ اپنے والد سے رات کے چور شکاری کے بارے میں بات کرنے کے لیے بے چین تھا لیکن اُس کے والد نے اُس کو اپنا دھیان پڑھائی میں لگانے کے لیے کہا تھا۔ کچھ دنوں بعد انھوں نے خود جاوید کو بلایا اور کہا "میرے بیٹے! اُس روز تمھاری رات کی چہل قدمی اور چور شکاری کے بارے میں رپورٹ نے تحقیقات میں بہت مدد دی۔ یہ معلوم ہوا ہے کہ وہ انڈے چڑیوں کے اُس چھوٹے سے گروپ کے تھے جن کی عجیب عادت ہوتی ہے کہ وہ انڈے دیتی تو ہیں لیکن انھیں سیتی نہیں"۔

"تعجب ہے! تب پھر چوزے کس طرح انڈوں سے باہر آتے ہوں گے؟"

"یہ چڑیاں انڈوں کو ایسی جگہ رکھتی ہیں جہاں قدرتی گرمی سے اُن سے بچے نکل آتے ہیں۔ ریت اور پتیوں کے تودے جو تم نے جزیرے پر دیکھے وہ جگہ ہے جہاں یہ چڑیاں اپنے انڈے دینے اور انھیں سینے کے لیے بڑے تودے کی شکل میں ڈھانپ دیتی ہیں۔ مقررہ وقت پر اندر کی گرمی انڈوں میں سے بچے نکال دیتی ہے اور چوزے اتنے طاقت ور ہوتے ہیں کہ وہ اپنے باہر کا راستہ پا لیتے ہیں"۔

"کتنی دل چسپ بات ہے!" جاوید نے اظہار کیا۔

"ہاں۔ لیکن رات کا چور شکاری، مچھیروں کا سردار انڈوں کی چوری کر رہا تھا"۔

"میرا خیال ہے وہ ان کو مچھلیوں کی ٹوکریوں میں بیچنے کے لیے یہاں بھیج دیتا ہے"۔

"ہاں۔ اُس کے آدمی اس کنارے پر سستے داموں مچھلی کی ٹوکریاں انڈوں کے لیے خرید لیتے ہیں اور انھیں بھاری داموں بیچ دیتے ہیں۔ دونوں آدمی اپنا حصہ بانٹ لیتے ہیں"۔

"لیکن تب تو یہ چڑیاں آہستہ آہستہ غائب ہو جائیں گی۔ کیا ایسا نہیں ہو گا، اگر انڈوں میں سے بچے نہیں نکلیں گے تو"، جاوید نے اظہار کیا۔

"وہ تعداد میں پہلے ہی کم ہونا شروع ہو گئی ہیں۔ جیسا کہ ٹومو نے اشارہ دیا"۔ اُس کے والد نے اضافہ کیا۔

"کیا مچھیروں کے سردار کو پکڑا نہیں جا سکتا اور اس کو سزا نہیں دی جا سکتی؟" جاوید نے سوال کیا۔

"یقیناً، تمھارے اور ٹومو کی وجہ سے۔ قدرت میں دل چسپی رکھنے والے لوگ جزیرے پر آئیں گے ان چڑیوں کا قریب سے مشاہدہ کرنے کے لیے۔ وہ ان میگاپوڈس یا مالیو چڑیوں کی، جیسا کہ وہ جانی جاتی ہیں۔ حفاظت کی کوشش کریں گے اور ان کے انڈوں کی بھی"۔

جاوید اندر سے خوش تھا۔ اسی طرح ٹومو بھی چڑیوں کے لیے خوش تھا۔

"کیا آپ میری چھٹیوں کے دوران دوبارہ مجھے جزیرے جانے دیں گے؟" اس نے اپنے والد سے درخواست کی۔

"یقیناً، جاوید" اس کے والد نے جواب دیا۔

جے دُرگا

دُرگا اچھلتی کودتی گھر میں داخل ہوئی۔ "رادھاکاکی مجھے بھوک لگی ہے"۔ اپنے اسکول کا بیگ ایک طرف پھینکتے ہوئے وہ روز کی طرح چلائی۔ وہ گھر میں اپنی من پسند جگہ لکڑی کے جھولے پر بیٹھ گئی۔ لیکن رادھاکاکی ناشتے کا سامان نہیں لائیں۔

"رادھاکاکی"۔ اس نے دوبارہ پکارا۔

"درگا صبر کرو"۔ کیا تمھیں معلوم نہیں ہے ہر کوئی نوراتری پوجا کی تیاریوں میں لگا ہے، جو کل ہے"۔

"اوہ، اس کے بارے میں میں بالکل بھول گئی تھی۔ رادھاکاکی مہربانی کر کے مجھے دیوی کے وہ سب زیورات دیکھنے دو...... تم اُن کو دیوی پر چڑھانے کے لیے ذمہ دار ہو"۔

"ہاں، میں انچارج ہوں۔ لیکن میں اس بارے میں یقینی نہیں ہوں کہ میں ان کو تمھیں دیکھنے دوں۔ تم انھیں دیکھنے میں اتنا وقت لگاتی ہو کہ میرے کام میں دیر ہو جاتی ہے اور پھر تمھاری ماں اور دادی مجھے ڈانٹیں گی۔ تم انھیں کتنی ہی بار دیکھ چکی ہو۔ اس میں نیا کیا ہے......؟"

"دھڑام......!" ایک زور کی آواز سے وہ دونوں اُچھل پڑیں۔ یہ دروازہ بند کرنے کی آواز تھی۔ وامن راؤ، درگا کے والد اندر آئے۔

"اے! تمھارا وہ پیارا مادھو کہاں ہے؟ وہ دہاڑے۔

درگا کی دادی کمرے میں دوڑی آئیں جب انھوں نے سنا کہ ان کا بیٹا آگیا ہے۔ درگا کی ماں بھی اندر آگئی۔

"مادھو کو کیا ہوا" جانکی بائی، درگا کی دادی نے فکر مندی سے پوچھا۔

"مجھے اُمید ہے، اُسے کچھ نہیں ہوا ہوگا۔ لیکن پولیس اُس کے پیچھے ہے۔ وہ آج دکان پر اُس کی رہائش کے بارے میں معلومات کرنے آئی تھی۔ جب میں نے اُنھیں بتایا کہ ہمیں نہیں معلوم کہ وہ کہاں ہے۔ انھیں مجھ پر یقین نہیں آیا۔ انھوں نے مجھے برا بھلا کہا۔ انھوں نے مجھے دھمکی دی اور تمھارے لاڈلے بیٹے کی وجہ سے پولیس نے بہت سے لوگوں کے درمیان میری بے عزتی کی! اب تمام بازار کو پتہ چل جائے گا"۔

"چپ ہو جاؤ، وامن۔ مادھو نے ایسا کچھ غلط نہیں کیا ہے جس کی وجہ سے تم شرمندہ ہو۔ وہ دیش کی آزادی کے لیے لڑ رہا ہے"۔ جانکی بائی نے دلیل دی۔

"مجھے معلوم ہے تم ہمیشہ اُس کی طرف داری کروگی۔ لیکن ذرا باہر کی طرف تو دیکھو

! اُس کی وجہ سے ہمارا گھر پولیس کے گھیرے میں ہے۔ مجرموں کی طرح ہمارے اوپر نظر رکھی جا رہی ہے"۔ وامن نے اپنی بات جاری رکھی۔

'اُس نے ایسا کیا کیا ہے کہ اُس کے ساتھ ایسا سلوک کیا جا رہا ہے؟" جانکی بائی نے سوال کیا۔

"مجھے نہیں معلوم۔ شاید اُس نے بم پھینکے ہوں یا ٹرین پر حملہ کیا ہو"۔

"نہیں۔ نہیں۔ وہ کبھی ایسا نہیں کرے گا۔ وہ تشدد میں یقین نہیں رکھتا"۔ رادھا، مادھو کی بیوی، بیچ میں ہی بولی۔

"کیا میں اپنے بھائی کو تمھارے ذریعے سے جانتا ہوں؟" وامن راؤ چیخا۔ رادھا کمرے سے باہر آگئی اور درگا بھی پیچھے چلی آئی۔

ایک گھنٹہ بعد جب جانکی بائی نے رادھا اور دُرگا کو پکارا سب کچھ پرسکون ہو چکا تھا۔ تیاریوں کی چہل پہل تناؤ بھری خاموشی میں بدل گئی تھی۔ مزے دار پکوان باورچی خانے میں ادھ پکے رکھے تھے۔ سجاوٹ کے لیے لائے گئے پھول ٹوکری میں ہی رکھے رہے۔

وامن راؤ کا کہیں پتہ نہیں تھا۔ درگا کی ماں بھی اپنے کمرے میں آرام کے لیے چلی گئی تھی۔
"رادھا، پوجا کی تیاریاں شروع کرو۔ کچھ بھی ہو، نوراتری کی پوجا تو کی جانی ہے اس لیے کام کرو۔ درگا، اپنی کاکی کی مدد کرو"۔

جانکی بائی نے کہا۔ درگا اپنی رادھا کاکی کے پیچھے بڑے ہال کی طرف چل پڑی۔ تبھی انھیں دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز سنائی دی۔ رادھا دروازہ کھولنے گئی۔ وہاں ایک پولیس والا تھا جو پانی مانگ رہا تھا۔

"میں لاتی ہوں"۔ رادھا نے جواب دیا۔

"نہیں، میں کنویں میں سے خود لے لوں گا"۔ پولیس والے نے اندر قدم رکھتے ہوئے کہا۔

رادھا کنویں کی طرف چلی۔ پولیس والا بھی اُس کے پیچھے گیا۔ "سنو، رادھا بھابھی"۔ وہ بولا۔

رادھا تیزی سے گھومی۔ اُس کے چہرے پر تعجب کے آثار دیکھ کر پولیس والے نے کہا "میں راگھو جادھو ہوں، مادھو کا ایک دوست۔ مجھے ابھی ابھی اطلاع ملی ہے کہ مادھو اور اُس کے ساتھی 'چتر شرنگی' کے مندر میں چھپے ہوئے ہیں اور آج رات پولیس مندر کا محاصرہ کرنے جارہی ہے۔ اس لیے مہربانی کر کے اُس کے پاس پیغام بھجوا دو کہ وہ اس جگہ کو چھوڑ دے۔ نہیں تو کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ ان کو زندہ یا مردہ پکڑنے کے احکامات ہیں"۔

اوہ، بھگوان! مجھے امید ہے یہ چھوٹی لڑکی راز نہیں کھولے گی!" جادو نے خیال ظاہر کیا۔

"نہیں، نہیں میں ایسا نہیں کروں گی"۔ درگا بولی۔

"لیکن بھیا ہم کس طرح پیغام بھیج سکتے ہیں، جب کہ ہم گھرے ہوئے ہیں؟" رادھا نے سوال کیا۔

"یہ بات تمھیں طے کرنا ہے، کیجیے جو کچھ بھی آپ کر سکتی ہیں۔ لیکن ایسے آدمی جو بھیجیے جس پر آپ بھروسہ کر سکتی ہوں۔ اب مجھے چلنا چاہیے۔ اگر نہیں جاؤں گا تو دوسرے پولیس والے مجھ پر شک کرنے لگیں گے"۔ راگھو جادھو اپنے ساتھیوں کے لیے پانی کی ایک بالٹی لے کر باہر آگیا۔

رادھااور درگا کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ پیغام دینے کے لیے کس کو بھیجیں۔ وامن راؤ، درگا کے والد، وہ جانتی تھی کبھی نہیں جائیں گے۔ جانکی بائی، اُس کی دادی اور درگا کی ماں کا سوال ہی نہیں اٹھتا تھا۔ رادھا جانا چاہتی تھی، لیکن انھیں یقین تھا کہ پولیس اس کا پیچھا کرے گی کیوں کہ وہ مادھو کی بیوی ہے۔ وہ یہ بھی جانتی تھی کہ رادھا کی غیر موجودگی کا فوراً ہی دوسرے گھر والوں کو پتہ چل جائے گا۔

"میں سمجھتی ہوں، مجھے جانا چاہیے۔ میں مناسب شخص ہوں"۔ درگا بولی۔

"درگا تم اتنا لمبا راستہ کیسے طے کروگی؟ دوسری بات یہ کہ وہ تمھارے اوپر نظر رکھیں گے کیوں کہ تم اس گھر کی ایک فرد ہو، رادھا نے کہا۔

"تب میں ایک غیر خاندان والی کی طرح جاؤں گی"۔

"غیر خاندان والی سے تمھاری کیا مراد ہے؟"

"میں اپنا بھیس بدل لوں گی۔ اب ہمیں سوچنا چاہیے کہ میں کیا بنوں! ہاں، میں گنگو نوکرانی کی لڑکی بن سکتی ہوں۔ آؤ۔ رادھا کاکی!" درگا نے آنے والی خطرناک مہم کے تمام جوش میں کہا۔

"لیکن درگا......"

"نہیں، لیکن رادھا کاکی، ہمیں جلدی کرنا چاہیے۔ مجھے بابا کے دکان کے آنے سے پہلے واپس آجانا چاہیے۔ اب پہلے ہی ساڑھے تین بج چکے ہیں"۔ اُس نے اپنی پیاری فراک، لال ربن والا جالی دار دوپٹہ اور سنہرے بندے اتارے اور پندرہ منٹ کے اندر گنگو جو پرانا لہنگا اور بلاؤز پہنے تھی، اُس کے بال ڈھیلے بندھے ہوئے تھے۔ صدر دروازہ کھولا۔

"ٹھیک ہے بائی، میں اب جارہی ہوں"۔ اس نے باہر نکلتے ہوئے کہا۔

"شام کے کام کے لیے جلدی آنا"۔ رادھا بولی

"اے لڑکی! تم اس بنڈل میں کیا لے کر جارہی ہو؟" پولیس والوں میں سے ایک نے پوچھا۔

"ارے بابا، بائی نے مجھے چند روٹیاں گھر لے جانے کے لیے دی ہیں جو کہ ہمارا باپ بھی ہمیں کبھی مہیا نہیں کرتا۔ اگر اُن کی مہربانی نہ ہو تو ہم بھوکے ہی سو جائیں گے"۔ درگا نے پورے طور پر گنگو کی نقل کرتے ہوئے جواب دیا۔ رادھا نے بڑی مشکل سے اپنی ہنسی پر قابو پایا۔



"ٹھیک ہے گنگو اب جلدی کرو اور وقت برباد مت کرو" نہیں تو تمھیں کام کے لیے دیر ہو جائے گی اور میرے پاس کھانا پکانے کے برتن نہیں ہیں"۔ رادھا نے اُس کو جلدی کرنے کے لیے کہتے ہوئے کہا۔

"ہا، بائی، ہا" درگا دوربھاگتے ہوئے بولی۔ وہ بڑی سڑک تک آگئی اور مندر کی طرف چل پڑی۔ وہ چلتی رہی اور چلتی رہی۔ روٹیوں کے بنڈل کے ساتھ چلنا مشکل ہو رہا تھا اور ایک مرتبہ اُس نے سوچا کہ وہ انھیں سڑک کے کنارے کھڑی گائے کو کھلا دے۔ لیکن اچانک اُسے خیال آیا ہو سکتا ہے مادھو کاکا کو جو مندر میں چھپے ہیں، کھانے کی ضرورت ہو"۔ اسی لیے اُس نے روٹیوں کے بنڈل کو اپنے ساتھ لے جانے کا فیصلہ کر لیا اور دوبارہ چلنا شروع کر دیا۔ مین روڈ پر آنے والے تہوار کے سبب کافی بھیڑ تھی۔ درگا کو تیز چلنے میں دقت ہو رہی تھی کیوں کہ لوگ تیزی سے اُس کے پاس سے گزر رہے تھے۔

اُس نے چھوٹا راستہ اختیار کرنے کا فیصلہ کیا پھر بھی سڑک ختم ہوتی ہوئی نظر نہیں آتی تھی۔ وہ چلتی رہی۔ آخر میں، جب اُس نے مندر کی گھنٹیاں سُنیں تو اس نے اطمینان کا سانس لیا۔ مندر پر لگا ہوا بھگوا جھنڈا اب نظر آ رہا تھا۔ وہ تیز تیز چلی۔ آخرکار درگا مندر پہنچ گئی۔ دروازے کے دونوں طرف دکان دار اپنی دکانیں لگانے میں مصروف تھے۔ اندر کی طرف فرش کی صفائی کی جا رہی تھی۔ پھولوں کے ہاروں سے مین ہال سجا ہوا تھا پنڈت جی اُن کام کرنے والوں کو ہدایتیں دے رہے تھے۔ ہر سال نوراترے سے پہلے ان تصویروں پر دوبارہ رنگ کیا جاتا تھا۔

دُرگا نے چاروں طرف دیکھا"۔ اُسے نہیں معلوم تھا کہ وہ مادھو کاکا اور اُن کے ساتھیوں کو کہاں دیکھے وہ مندر کے باہر آگئی اور اُس کے پچھواڑے گئی۔ وہاں بالکل خاموشی اور تنہائی تھی۔ اُسے ڈر لگنے لگا۔ 'کیا میری ساری محنت بیکار جائے گی؟ راگھو جادھو نے مجھے یہ کیوں نہیں بتایا کہ مادھو کاکا کو کیسے تلاش کروں، اُس نے مندر کے چاروں طرف بار بار چکر لگاتے ہوئے سوچا۔

دُرگا تقریباً رونے کو ہی تھی جب اُس نے کسی کو کہتے ہوئے سنا" جے درگا، جے بھوانی" بڑے مندر کے ساتھ بنے چھوٹے مندر سے یہ آواز آتی محسوس ہوئی۔ کچھ بھجن گا رہے تھے جب کہ دوسرے اُس جگہ کو سجانے میں لگے ہوئے تھے۔ اس سے درگا کے دماغ میں ایک خیال آیا۔

جیسے ہی بھجن ختم ہوا اُس نے گانا شروع کر دیا "اننتا، کیشوا مادھوا، تریا نامت رسے گو وادا" (اننت، کیشو، مادھو، تمھارے ناموں میں کتنی مٹھاس ہے)۔ یہ مادھو کاکا کا پسندیدہ بھجن تھا جو اُن کے گھر اکثر گایا جاتا تھا۔ گاتے گاتے درگا نے چاروں طرف دیکھا۔ اُس نے دیکھا کہ ایک آدمی نے کام روک دیا ہے اور وہ اُسی کی طرف آرہا ہے۔ پھر وہ ایک کھمبے کے پیچھے چلا گیا۔ اُس کی نگاہوں سے لگتا تھا اُسے کچھ شک ہو گیا۔ اُس نے اُسے نہیں پہچانا ہے۔ وہ گاتی رہی اور چاروں طرف گھومتی رہی۔ وہ کھمبے کے پاس آئی اور "مادھو، مادھو پر زور دیا اور آخر کہا 'مادھو، مادھو کاکا' پر جیسا کہ وہ گھر پر اُسے تنگ کرنے کے لیے کرتی تھی اور پھر اُس (درگا) نے اُسے پہچان لیا۔

جب لوگ تالیاں بجانے لگے وہ باہر چلی گئی۔ اُس نے دیکھا مادھو کاکا اُس کے پیچھے آرہے ہیں۔ اس لیے وہ مندر کے پیچھے سنسان جگہ کی طرف چل دی۔ اب اُسے ڈر نہیں لگ رہا تھا کیوں کہ اُس کے مادھو کاکا وہاں تھے۔ درگا ایک کونے میں رُک گئی۔ جہاں اُنھیں کوئی نہیں دیکھ سکتا تھا۔

"تم کون ہو؟" مادھو کاکا نے پوچھا۔

"کیا آپ مجھے نہیں پہچانتے؟ میں درگا ہوں"، نہیں تو میں اپنا بھجن کیسے گاتی جو مادھو کاکا پر ختم ہوتا ہے؟"

"اوہ، بھگوان! درگا، میں واقعی تمھیں نہیں پہچان سکا۔ جب تم نے بھجن شروع کیا مجھے تبھی شک ہوا تھا، لیکن تم بالکل الگ لگ رہی تھیں اور میں اپنے خواب میں بھی نہیں سوچ سکتا تھا کہ تمام لوگوں میں سے تم یہاں آؤ گی۔ تمھیں کیسے پتہ چلا کہ میں یہاں ہوں؟"

"مجھے ہی نہیں، تمام پولیس فورس کو معلوم ہے کہ تم یہاں ہو۔ وہ اس جگہ کو گھیرنے والے ہیں۔ نہیں تو وہ تمھیں زندہ یا مردہ پکڑ لیں گے؟"

"تمھیں یہ سب کیسے معلوم ہوا؟"

"تمھارے دوست راگھو جادھو نے جو پولیس میں ہیں، یہ سب رادھا کاکی کو بتایا"۔

"وہ رادھا سے کیسے ملا؟"

"پولیس نے ہمارے گھر کا گھیرا کیا ہوا ہے۔ اگر تم نے آنے کی کوشش کی تو وہ تمھیں پکڑ لیں گے۔ راگھو جادھو ڈیوٹی پر تھے اور انھوں نے ہم تک کسی طرح یہ پیغام پہنچادیا"۔

"شکریہ درگا، لیکن رادھا نے تمھیں کیوں بھیجا؟"

"اور کون آسکتا تھا جب کہ گھر کی نگرانی کی جارہی تھی؟ میں کسی طرح گنگو کے بھیس میں آسکی"۔ اچانک درگا کو بنڈل میں رکھی روٹیاں یاد آئیں۔ "اور یہ روٹیاں لے لو جو رادھا کاکی نے مجھے گنگو کا بھیس مکمل کرنے کے لیے دی تھیں"۔

"کتنے عرصے بعد گھر کا بنا ہوا کھانا ملا۔ لیکن درگا تم اب واپس جاؤ اس سے پہلے کہ اندھیرا ہو جائے۔ میں پنڈت جی کے بیٹے سے کہوں گا کہ وہ تمھیں کنپتی چوک تک جانے کے لیے سائیکل دے دے اور وہاں سے تم واپس گھر جا سکتی ہو۔

"لیکن کاکا، تم رات سے پہلے یہ جگہ چھوڑ دینا"۔

"ہاں، ہاں، ہم ایسا ہی کریں گے۔ اپنی رادھا کاکی سے کہنا پریشان نہ ہوں"۔

درگا وقت سے کافی پہلے ہی گھر پہنچ گئی۔ پولیس نے اُس کو نہیں روکا۔

"بائی"، اُس نے پکارا۔ رادھا دوڑتی ہوئی آئی۔ رادھا اُس کو چپٹانے ہی کو تھی کہ اُس نے دیکھا دروازہ کھلا ہے اور پولیس اُس کے اردگرد منڈلا رہی ہے۔ وہ رُک گئی۔ درگا نے آنکھ ماری اور بولی، "بائی، دیکھو میں وعدے سے پہلے ہی واپس آگئی۔ اب میں اپنا کام جلدی سے ختم کرلوں"۔ اور درگا اندر چلی گئی۔ دروازہ بند کرنے کے بعد رادھا بھی اُس کے پیچھے چھپکئی۔

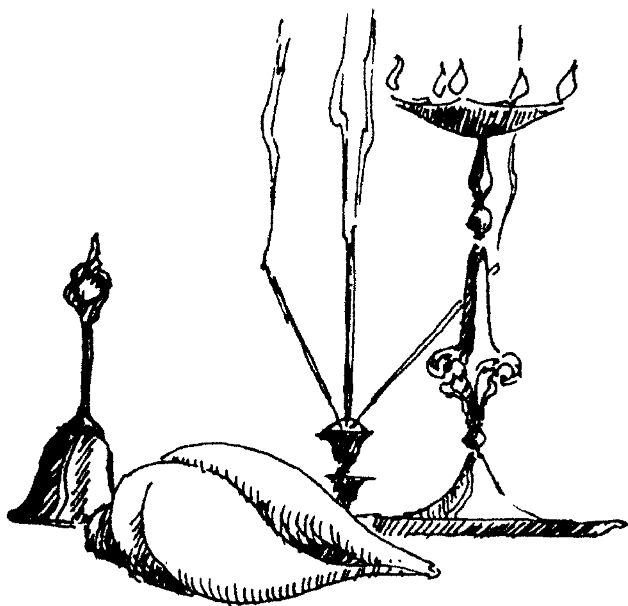
درگا نے جلدی جلدی اپنی کہانی سنائی۔ اُس کے والد دکان سے نہیں لوٹے تھے۔ اُس کی ماں اب بھی کمرے میں تھیں، جب کہ اُس کی دادی پوجا کے کمرے میں مصروف تھیں۔ اُنھیں اُس کے جانے کا پتہ نہیں چلا تھا۔

رات کا کھانا جلدی کھانے کے بعد سب لوگ سونے کے لیے چلے گئے۔ رادھا کاکی اور درگا نہیں سو سکیں۔ دونوں تناؤ میں تھیں۔ انھوں نے دعا کی کہ مادھو کے لیے حالات ٹھیک رہیں

"گوری مندر پر پولیس کا چھاپہ ناکام رہا۔ آزادی کے مجاہد مادھو گو کھلے کی رہنمائی میں فرار ہو گئے"۔ صبح کا اخبار بیچنے والا لڑکا چلایا اور اخبار اُن کے گھر میں پھینک دیا۔

رادھا کاکی نے درگا کو دیکھا اور اس کو چمٹا لیا۔

جانکی بائی نے بھی لڑکے کی آواز سنی۔ انھوں نے رادھا کو پوجا کے کمرے میں بلایا۔ درگا بھی گئی۔ وامن راؤ اور اُس کی بیوی بھی وہاں تھے۔ جانکی بائی نے دیا جلایا اور نمسکار کرتے ہوئے وہ بولی "جے درگا!"



رگھو اور میں

وہ دیوالی کی رات تھی۔ میں اپنی چھت پر کھڑا اپنے محلے میں بے شمار چمکتی ہوئی روشنیاں دیکھ رہا تھا۔ گلی کے اُس پار ایک گھر تھا جو موم بتیوں اور مٹی کے دیوں کی قطاروں سے سجا ہوا تھا۔ وہاں چھجے پر ایک لڑکا تھا، جو اکیلا ہی پٹاخوں سے کھیل رہا تھا۔ اُس نے تھوڑی دیر پہلے ہی ایک انار جلایا تھا جو چندھیانے والی روشنی کے فوارے کی شکل میں پھٹا۔ پھر اُس نے آسمان میں ایک ژوں کرتا ہوا راکٹ چھوڑا۔ میں نے اُسے بہت اونچے اپنے سروں پر رنگین ستاروں کی شکل میں پھٹتا ہوا دیکھا۔

میں بھی ایک راکٹ داغنا چاہتا تھا، میں بھی ایک انار چھوڑنا چاہتا تھا اور جلتی ہوئی پھلجڑیاں اپنے ہاتھوں میں لینا چاہتا تھا۔

اُس لڑکے نے اوپر دیکھا اور مجھے گھورتے ہوئے پایا۔

''کیا تم بھی چلانا چاہتے ہو؟'' اُس نے پوچھا

میں نے سر ہلایا۔

لڑکے نے کوئی چیز پرانے اخبار میں لپیٹی اور سڑک کے پار میری طرف پھینکی۔ اُس میں بہت سے پٹاخے تھے اور ایک ماچس کی ڈبیا۔ میں نے اُن سب کو چھڑایا اور بہت اچھا وقت گزرا۔

''تمھارا کیا نام ہے؟'' لڑکے نے آواز دے کر پوچھا۔

''اشرف''

''میں راگھو ہوں'' اس نے کہا۔

اس طرح میں اور راگھو دوست بن گئے۔

اگر چہ ہم پڑوسی تھے اور ایک پتلی سی گلی ہمارے گھروں کو الگ کرتی تھی، ہمارے والدین کبھی آپس میں نہیں ملتے تھے۔ لیکن میں اور راگھو رفتہ رفتہ اچھے دوست بن گئے۔ سہ پہر کو ہم گلی ڈنڈا اور کنچے کھیلتے جب کہ ہمارے خاندان پڑے سوتے رہتے۔

رگھو کو مٹھائی کا بہت شوق تھا۔ جب عید آئی تو میں نے اُسے بتایا کہ میری ماں کس طرح کے میٹھے پکوان بنا رہی تھیں۔ میٹھی سوئیاں جن پر بہت زیادہ بادام اور کشمش چھڑکے ہوئے تھے اور جو چاندی کے ورق سے ڈھکی ہوئی تھیں، جس کے بیان سے ہی منہ میں پانی آگیا۔

''تم آنا اور سوئیاں کھانا''۔ میں نے رگھو کو دعوت دی۔

''لیکن کیسے ؟ امّاں مجھے جانے کی اجازت نہیں دیں گی''۔ رگھو بولا۔

''پھر انھیں مت بتانا، لیکن تم ضرور آنا۔ تم آؤ گے نا!''

''ہاں''

عید والے دن میں نے اپنا سِلک کا نیا کرتا اور کارچوبی والی ٹوپی، جو ابّا کشمیر سے لائے تھے، پہنے۔ میں چاہتا تھا کہ رگھو مجھے اپنے بہترین لباس میں دیکھے۔

سہ پہر میں جب گھنٹی بجی میں دروازہ کھولنے کے لیے دوڑا۔

وہاں رگھو تھا۔

''کون ہے ؟'' میری ماں کی سہیلی نے باورچی خانہ سے پوچھا۔

''رگھو''، میں نے انھیں بتایا۔

''یہ رگھو کون ہے ؟''

''وہ لڑکا جو سامنے رہتا ہے''۔

''اُس خاندان کا ؟ ہمیں اُن سے کوئی تعلق نہیں رکھنا ہے۔ اس سے چلے جانے کے لیے کہو''۔ امّاں کی سہیلی بولیں۔

''لیکن کیوں، آنٹی ؟''

''سوالات مت کرو۔ جو میں نے کہا وہ کرو''۔

رگھو واپس جانے لگا تھا میں اُس کے پیچھے دوڑا اگر چہ مجھے امّاں کے چیخنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

''سنو! میں تمھارے لیے سوئیاں لاؤں گا''۔ میں چلایا۔

''مجھے نہیں چاہیئے''۔ اس نے جواب دیا۔

میں نے اُسے جانے نہیں دیا۔ میں نے رگھو کا ہاتھ پکڑ لیا۔ "لیکن میں چاہتا ہوں کہ تم وہ کھاؤ۔ سنو، اسٹیشن کے سامنے والے پارک میں آجاؤ۔ ہم وہاں سوئیاں کھانے کے لیے ملیں گے"۔

"تم بہت ضدی ہو، اشرف"۔ رگھو مسکرایا۔

میں نے اپنے اسکول کا ٹفن بکس اٹھایا اور اس کو جلدی سے میٹھی ڈش سے بھر لیا۔ پھر میں جلدی سے پارک کی طرف بھاگا۔ ہم دونوں نے چاٹ کر ٹفن بکس کو اچھی طرح صاف کر دیا۔

"مجھے تعجب ہے ہمارے خانان آپس میں باتیں کیوں نہیں کرتے"۔ رگھو نے تعجب سے کہا۔

"ایسا لگتا ہے کہ کوئی پرانا جھگڑا ہے۔ ہمارے خاندان والے نسلوں سے یہاں رہتے آرہے ہیں۔ حقیقت میں مغلیہ دور سے"۔

"میرے خاندان والے بھی، غدر کے دنوں میں یہاں تھے"۔

"کیا اتنے پرانے جھگڑے کو جاری رکھنا بے وقوفی نہیں ہے؟"

"ہاں"

ہم چیخوں کی آواز سن کر رک گئے۔ ہم نے شور کی سمت دیکھا اور دیکھا کہ ایک آدمی، جو تقریر کر رہا تھا، چاروں طرف لوگ اکٹھا تھے۔ وہ کسی چیز کے بارے میں جوش سے بول رہا تھا۔ بیچ بیچ میں وہ غصہ میں اپنا گھونسہ اُٹھاتا اور ہوا میں لہراتا۔ بھیڑ اس طرح خوش ہوتی اور تالیاں بجاتی۔ جوں جوں تقریر آگے بڑھتی گئی، سننے والوں کی بھیڑ میں جوش زیادہ سے زیادہ تر ہوتا گیا۔

آخر میں جوشیلے مقرر کی رہنمائی میں بھیڑ آگے بڑھنے لگی۔

"وہ کہاں جارہے ہیں؟" ہم چلائے۔

"اے لڑکو، تم گھر بھاگ جاؤ!" ایک راہ گیر نے تنبیہ کی۔ "وہ جوشیلی بھیڑ ضرور کچھ تباہی و بربادی لائے گی"۔

ہم جلدی سے اٹھ کھڑے ہوئے اور اپنے گھروں کی طرف بھاگے۔ ہم یہ دیکھ کر خوفزدہ ہوئے کہ بھیڑ ٹھیک ہمارے گھروں کی طرف بڑھ رہی تھی۔

ہم نے ایک شارٹ کٹ راستہ اختیار کیا اور بھیڑ کے داخل ہونے سے پہلے ہم اپنی گلی میں تھے۔ دوکانداروں نے جلدی جلدی اپنے شٹر گرا لیے تھے۔ ماؤں نے باہر آکر اپنے بچوں کو بلایا اور جلدی سے دروازے بند کر لیے۔ گلی جلدی ہی سنسان ہو گئی۔ صرف ہم دونوں وہاں رہ گئے تھے۔

"اشرف!" رگھو نے مجھے روکا۔ "وہ آدمی جلدی ہی یہاں آجائیں گے۔ وہ تباہ کرنے کے موڈ

میں ہیں۔ ہمیں انھیں آگے بڑھنے سے روکنا چاہیے"۔

"کیا تم پاگل ہو گئے ہو؟" میں چیخا۔ "وہ تمھاری نہیں سنیں گے"۔

"میں انھیں مجبور کر دوں گا! اگر میں اور تم دوست ہو سکتے ہیں، دیوالی کو پٹاخے چھوڑ سکتے ہیں اور عید پر اکٹھے سوئیاں کھا سکتے ہیں تو بڑے دوست کیوں نہیں بن سکتے؟"

رگھو نے میرا ہاتھ پکڑا اور گلی کے دروازے کی طرف مڑا۔

"کیا تم کو ڈر نہیں لگ رہا ہے؟" میں نے اُس کے کان میں کہا۔ اُس نے ایک عجیب جواب دیا۔

"اشرف، کیا تم نے "گاندھی فلم" دیکھی ہے۔

"ہاں۔ لیکن......"

"باپو کبھی نہیں ڈرتے، اُس وقت بھی نہیں جب انھیں لاٹھیوں سے پیٹا گیا!

جب بھیڑ ہم تک پہنچی، ہم تنگ گلی کے ادھر اُدھر کھڑے ہو گئے اور قریب آتے لوگوں کو بے خوف دیکھتے رہے۔

"رُک جاؤ"۔ ہم چیخے۔ "رُک جاؤ"۔

وہ آدمی بھونچکے رہ گئے اور فوراً رُک گئے۔

"راستہ دو، لڑکو!" لیڈر چلایا۔

"راستہ سے ہٹ جاؤ"، کچھ دوسرے بد تمیزی سے چلائے۔

"یہاں ہمارے گھر ہیں۔ ہم آپ کو ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھنے دیں گے!" ہم بھی چیخے۔

"کیا چوزوں!"

ہم دونوں نے پتھر اُٹھا لئے اور چلائے، "چلے جاؤ۔ اس سے پہلے کہ ہم تمھیں ماریں!"

"یہ کیا ہے، یہ کیا ہو رہا ہے؟" ان کے لیڈر نے پوچھا

وہ بھیڑ سے باہر آیا اور ہم سے نرمی سے معلوم کیا، "تم کیا چاہتے ہو، لڑکو؟" "ہمیں جانے دو!"

"نہیں" ہم سختی سے بولے

اچانک ایک غنڈا جیسے نوجوان نے رگھو کو زور سے ایک طرف ہٹا دیا اور میرا دوست زمین پر چت گر پڑا۔ وہ ایک پتھر سے ٹکرایا اور اُس کے ماتھے پر لگی چوٹ سے خون بہنے لگا۔ لیڈر آگے بڑھا۔

"کیا تمھارے چوٹ لگی ہے؟ تمھارا نام کیا ہے؟"



رگھو کو زخمی دیکھ کر میں غصے میں آگیا۔ اس سے پہلے کہ رگھو جواب دیتا، میں چیخنے لگا۔ میں لیڈر کی طرف لپکا اور اپنے دونوں گھونسوں سے پاگلوں کی طرح چیختا ہوا اُسے مارنے لگا۔

"یہ رگھو میرا دوست ہے! میں اشرف ہوں!" میں چیخا

"ہم دوست ہیں! ہم یہاں رہتے ہیں اور ہم نہیں چاہتے کہ تم ہمارے گھر برباد کرو! مہربانی کر کے یہاں سے چلے جاؤ!"

میرا خیال تھا کہ بھیڑ میری طرف لپکے گی۔ لیکن وہ بے حس و حرکت کھڑی رہی۔

"رگھو...... اور اشرف!" لیڈر بڈبدایا۔ "یہ دونوں لڑکے دوست ہیں؟" پھر وہ اُن لوگوں کی طرف مڑا جو چہ می گوئیاں کر رہے تھے اور بڑبڑا رہے تھے۔

"ان لڑکوں نے ہمیں ایک سبق سکھایا ہے"۔ وہ نرمی سے بولا، "مہربانی کر کے تم سب اپنے گھروں کو واپس جاؤ۔ میں بچوں کے والدین سے بات کرنا چاہوں گا اور انھیں بتاؤں گا کہ اُن کے بیٹے کتنے بہادر اور عقل مند ہیں"۔

